اقبال اکیڈیمی حیدرآباد کا شش ماہی ترجمان

(اپریل ۲۰۱۲ء)

اقبال ریویو

اقبال اکیڈیمی حیدرآباد، انڈیا۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اقبال اکیڈیمی حیدرآباد کا شش ماہی ترجمان

(اپریل ۲۰۱۲ء)

برائے تبصرہ

اقبال ریویو

زیر اہتمام

اقبال اکیڈیمی ، حیدرآباد ، انڈیا

جلد (۲۲) شمارہ (۱)

مجلس مشاورت

۱۔ جناب محمد ظہیر الدین احمد
(صدر اقبال اکیڈیمی حیدرآباد)

۲۔ پروفیسر رفیع الدین ہاشمی (لاہور)

مجلس ادارت

۱۔ جناب محمد ضیاء الدین نیر
(نائب صدر اکیڈیمی)

۲۔ سید امتیاز الدین
(معتمد اکیڈیمی و ایڈیٹر)

بدل اشتراک

فی شمارہ ۷۵ روپے

ایک سال کے لیے (دو شمارے) ۱۵۰ روپے

بیرونِ ملک: فی شمارہ ۵ ڈالر یا متبادل رقم

خط و کتابت و ترسیل زر کا پتہ :

اقبال اکیڈیمی، گلشن خلیل: 10-5-7/1 تالاب ماں صاحبہ ۔ حیدرآباد ۔ 500028

آندھرا پردیش (انڈیا) ۔ فون: 66663950

e-mail:ihfiqbal@hotmail.com

کمپیوٹر کمپوزنگ : افضال الحق ندوی، محمد کلیم محی الدین، ''شارپ کمپیوٹر'' H.NO.16-8-907/A

نیو ملک پیٹ، قریب ریلوے اسٹیشن، حیدرآباد 500024 ۔ فون: 9392427796

ISBNNo: 81-86370-51-X

سید امتیاز الدین ایڈیٹر پرنٹر و پبلشر نے ۔ یس کے، گرافکس حمایت نگر، حیدرآباد سے طبع کروا کر
اقبال اکیڈیمی حیدرآباد سے شائع کیا۔

فہرست

(اقبال ریویو۔اپریل۲۰۱۲ء)

(الف)	اداریہ	ادارہ	۴
۱	اسرارخودی	پروفیسرڈکنسن	۶
۲	گورستان شاہی	محمد اقبالؔ	۱۱
۳	نظم ''گورستان شاہی''.....ایک مطالعہ	خالدسعید	۱۵
۴	کچھ اقبال کے بارے میں	رشیداحمدصدیقی	۲۶
۵	اقبال اورآرزوئے نایافت	امتیازعلی خان عرشی	۳۲
۶	ٹیگوراوراقبال(مشابہت وافتراق کے چنداہم پہلو)	منظرحسین	۴۱
۷	ڈاکٹراین میری شمل کی اقبال شناسی	محمدریاض	۵۳
۸	ڈاکٹرایساندروبوسانی(۱۹۸۸ء،۱۹۲۱)	صابرآفاقی	۶۶
۹	پیام اقبال	قاضی عبدالغفارصاحب	۷۶

English Section

Syed Sirajuddin	AN APPROACH TO THE READING OF IQBAL'S POETRY.		۱۰

☆☆☆

اداریہ

اقبال ریویو کا تازہ شمارہ تھوڑی سی تاخیر کے ساتھ آپ کی خدمت میں پیش ہے۔ اس تاخیر کے باوجود اس شمارے کے مضامین اتنے معیاری اور متنوع ہیں کہ آپ انہیں پڑھ کر ہمیں تاخیر کے لئے معاف کردیں گے۔ ایسے مضامین کو تلاش کرنا اور انہیں یکجا کر کے شائع کرنا عرق ریزی کا کام ہے اقبال ریویو کا ہر شمارہ علامہ کی یاد کو تازہ رکھنے اور ان کے کلام اور پیام کو نئی نسل تک پہنچانے کی ایک پیہم کوشش ہوتا ہے۔ اس رسالے میں ہم ہر مکتب خیال اور نقطۂ نظر کو پیش کرنے کی کوشش کرتے ہیں اقبال کی عظمت کا ایک ثبوت یہ بھی ہے کہ ان کے مخالفین کی ایک بڑی تعداد ان کی زندگی میں بھی موجود تھی اسرارِ خودی پر پروفیسر ڈکنسن کا مضمون مغرب کے نقطۂ نظر کو پیش کرتا ہے اور پڑھنے کے قابل ہے۔

پروفیسر خالد سعید ایک ذہین اقبال شناس ہیں گورستانِ شاہی کا تجزیاتی مطالعہ ان کی قابل قدر کاوش ہے۔ گورستانِ شاہی اقبال کی اچھی نظموں میں سے ایک ہے۔ اس کی اہمیت اس اعتبار سے بھی دوچند ہو جاتی ہے کہ یہ نظم اقبال کے پہلے دورۂ حیدرآباد کی یادگار ہے جس کی سوسالہ یاد اقبال اکیڈیمی نے ابھی پچھلے سال تازہ کی تھی۔ خالد سعید نے نظم کے استعاروں اور تلازموں کا بڑی چابک دستی سے جائزہ لیا ہے اگرچہ یہ نظم اقبال کی ابتدائی نظموں میں سے ایک ہے اور بعد کے کلام میں خود اقبال کے خیالات میں نمایاں تبدیلیاں رونما ہوئی تھیں لیکن اس نظم کی تمہید اس کا ارتقا اور بندش اقبال کی قدرتِ بیان کا ثبوت ہے۔ خالد سعید نے ہر پہلو سے اس نظم کا جائزہ لیا ہے جس سے نظم کو سمجھنے میں قاری کو بڑی مدد ملتی ہے۔

پروفیسر رشید احمد صدیقی نہ صرف ایک صاحب طرز ادیب تھے بلکہ اقبال سے ان کے روابط بھی گہرے تھے۔ رشید صاحب نے گنج ہائے گراں مایہ میں اقبال کا جو خاکہ لکھا ہے اس سے پتہ چلتا ہے کہ شاعر مشرق کی یاد ان کے دل پر گہرا نقش چھوڑ گئی تھی۔ اقبال کے بارے میں رشید صاحب کا مضمون ان کے بے مثال طرز نگارش کا ایک نمونہ ہے۔

امتیاز عرشی ایک عالم بے بدل تھے، ان کا مضمون ہمیں اپنے بزرگوں کی فراست اور دقت نظر کی یاد دلاتا ہے اقبال کی آرزوئے نایافت کو اجاگر کرنے کے لئے عرشی صاحب نے اقبال کے کلام کے بعض اہم حوالوں کو اپنے مضمون میں جس خوبی سے پیش کیا ہے۔ اس کی جتنی تعریف کی جائے کم ہے۔ منظر حسین صاحب نے بیسویں صدی کے دو اہم ترین شاعروں اقبال اور ٹیگور پر جس محنت سے قلم اٹھایا ہے اور مماثلت اور اختلاف کے جن پہلوؤں کی نشاندہی کی ہے۔ قاری کو دعوتِ فکر دیتے ہیں۔ اقبال پر مضامین تو بہت لکھے جاتے ہیں۔ لیکن منفرد طرز کے مضامین کی کمی ہے یہ مضمون اس کمی کو پورا کرتا ہے۔

ڈاکٹر انا میری شمل اقبال کی بڑی مداح تھیں انہوں نے اقبالؔ کے کلام کا ترجمہ بھی کیا ہے۔ محمد ریاض کا مضمون اس عظیم خاتون کی خدمات کا اعتراف بھی ہے اور اقبال کے کلام کی ہمہ گیری کو خراج بھی، اسی طرح صابر آفاقی کا مضمون ڈاکٹر ایسا ندرو بوسانی نہ صرف دل چسپ اور معلومات افزا ہے بلکہ ہمیں اسے چھاپتے ہوئے مسرت محسوس ہوتی ہے۔

قاضی عبدالغفار ایک بے مثال صحافی اور اپنی طرز کے بہت بڑے ادیب تھے ان کی زندگی کا بڑا حصہ حیدرآباد میں بھی گزرا۔ قاضی صاحب کا مضمون اہل نظر کا تبرک ہے جسے ہم نہایت احترام کے ساتھ شائع کر رہے ہیں۔

پروفیسر سید سراج الدین مرحوم، سابق صدر اقبال اکیڈیمی کا انگریزی مضمون سراج صاحب کی ذہانت اور کلام اقبال پر ان کی گہری نظر کو ظاہر کرتا ہے۔ ہم نے اس تحریر کو انگریزی حصے کی زینت بنایا ہے۔

غرض اقبال ریویو کا یہ شمارہ ہم اپنے قارئین کی خدمت میں اس امید کے ساتھ پیش کر رہے ہیں کہ آپ بھی اپنی رائے اور مشوروں سے نوازیں گے۔ ملک کے ادیبوں اور اقبال شناسوں سے ہماری گزارش ہے کہ ہمیں اپنے رشحاتِ قلم سے نوازیں، اگر آپ میں سے کسی کے پاس کسی قدیم رسالے میں شائع شدہ عمدہ مضمون ہو تو باقاعدہ حوالے اور فوٹو کاپی کے ساتھ روانہ فرمائیں تاکہ گاہے گاہے بازخواں کے تحت اسے ہم کسی اگلے شمارہ میں جگہ دے سکیں۔

ادارہ

پروفیسر ڈکنسن

اسرار خودی

ہفتہ وار رسالہ نیشن کے ریویو کا ترجمہ پیش ہے جو کیمبرج کے پروفیسر ڈکنسن کے قلم سے نکلا ہے اور ستمبر ۱۹۲۱ء کی معارف میں چھپا تھا۔ (ادارہ)

مسٹر ویلز نے اپنی ''تاریخ عالم'' کے آخری حصوں میں نہایت صحیح بصیرت سے کام لیکر مشرق پر مغرب کے تفوق و برتری کو تسلیم کرنے سے انکار کیا ہے وہ کہتے ہیں، مغرب کو غلبہ حاصل کئے ہوئے ابھی دن ہی کتنے ہوئے ہیں اور پھر ہم نے اس تین صدیوں کی مدت میں مشرق سے کچھ نہ سیکھا درآنحالیکہ کم از کم ایک صدی سے مشرق ہم سے تمام چیزیں سیکھتا رہا ہے قدرۃً وطبعاً مشرقی ہم سے کسی طرح کمتر نہیں۔ البتہ وہ متواضع واخاذ ہم سے زیادہ ہیں پس کیا وجہ ہے کہ مستقبل قریب میں وہ ہمارے اپنے درمیانی رشتہ کو الٹ نہ دیں۔

اس نقطۂ نظر سے دیکھیے تو جناب اقبال کی کتاب آئندہ واقعات کے حق میں ایک شگون نحس کی حیثیت رکھتی ہوئی معلوم ہوگی۔ ڈاکٹر نکلسن نے ہمارے سامنے اس شخص کے کلام کا اول بار انگریزی ترجمہ پیش کیا ہے جو نوجوان اسلامی ہندوستان اور غالباً ایران کی نظروں میں محبوب اور بلند پایہ قومی شاعر ہے۔ مثنوی کی زبان سے پورا لطف تو صرف وہی اشخاص اٹھا سکتے ہیں جو فارسی زبان سے واقف ہیں، تاہم ڈاکٹر نکلسن بھی ایک باکمال مترجم ہیں اور اتنا انگریزی کے واسطہ کے باوجود بھی نظر آجاتا ہے کہ ایک شاعر، اور غالباً بلند پایہ شاعر کا کلام ہمارے سامنے ہے بلند پروازی، جامعیت و مانعیت اور حسن تخیل، کم از کم یہ خوبیاں تو ترجمہ کے آئینہ سے پھوٹی نکلتی ہیں اور ہاں اصل موضوع کی ترجمانی بھی کافی ہو رہی ہے جو مغربی ناظرین کی خاص توجہ کے قابل ہے۔

آج سے کوئی پندرہ برس قبل اقبال، کیمبرج میں ڈاکٹر میکنا گارٹ سے (فلسفہ) پڑھ

رہے تھے اور اسی زمانہ میں وہ فارسی تصوف پر بھی ایک رسالہ تیار کر رہے تھے، اس وقت راقم ہذا کو اچھی طرح یاد ہے کہ اس نے اقبال کو ولیم بلیک کی تصانیف کے مطالعہ پر آمادہ کیا تھا اور اقبال نے اسے یہ یقین دلایا تھا کہ بلیک کے صفحات میں بھی انہی تجربات کا ذکر ہے جنہیں حکمائے مشرق بیان کرتے رہتے ہیں۔ اقبال نے غالباً اسی زمانہ میں (جرمن فلسفی) نیٹشے کا مطالعہ کیا اور اس درمیان میں یقیناً انہوں نے برگسن کا بھی مطالعہ کرلیا ہے ان کا موجودہ فلسفہ سیاست، جس کی توضیح انہوں نے اس انگریزی ترجمہ کے مقدمہ میں کی ہے ایک عجیب معجون مرکب ہے جس کی ترکیب میں زیادہ تر یہی مصنفین شامل ہیں ان کا یہ خیال کہ مکمل شخصیتوں کے درمیان امتزاج واعتدال کا نام حقیقت ہے ڈاکٹر میکنا گارٹ سے ماخوذ ہے البتہ اقبال نے اس حقیقت کو بجائے ظواہر زمانی کے عقب میں دائما و مستقبلاً موجود رہنے کے آئندہ کے لئے نصب العین قرار دیا ہے۔ برگسن کا رنگ اس قسم کے اشعار میں صاف جھلکتا ہوا ہے۔

وقت را مثلِ مکان گستردۂ امتیاز دوش وفردا کردۂ

☆

ای چو بورم کردہ از بستان خویش ساختی از دستِ خود زندان خویش

مگر سب سے زیادہ قوی اثر نیٹشے کا ہے قوت، خودی، ضرورت استیلاء اور منافع خصومات اس تعلیم سے ساری مثنوی لبریز ہے مثلاً

خاک گشتن مذہب پردانگی ست خاک را اب شوکہ این مردانگی ست

☆

سنگ شوائے ہمچو گل نازکبدن تاشوی بنیادِ دیوار چمن

یا پھر ایک جگہ اور ہے

زندگانی قوت پیدا ستے اصل او از ذوق استیلا ستے

☆

عفو بیجا سردیِ خونِ حیات سکتۂ در بیت موزون حیات

ہر کہ در قعرِ مذلت ، ماندہ است ناتوانی راقناعت خواندہ است
ناتوانی زندگی رارہزن است بطنش از خوف ودروغ آبستن است

اس فلسفۂ حیات کے معنیٰ یہ ہیں کہ خودی کی تکمیل ہو، یہ مقصد محبت وعشق سے حاصل ہوتا ہے جو آرزوئے جذب وفنا کے مرادف ہے چنانچہ اس فلسفہ کے نقطۂ نظر سے بالآخر بجائے اس کے کہ افراد ذات باری میں جذب ہوجائیں، ذات باری افراد میں جذب ہوکر رہے گی۔ اقبال ان تمام فلسفوں کے دشمن ہیں، جو ہستی واجب الوجود کو تسلیم کرتے ہیں۔ چنانچہ افلاطون کے جو وہ اس قدر مخالف ہیں اس کی بنا بھی بس یہی ہے خود کہتے ہیں کہ

> ''افلاطون پر میرا اعتراض درحقیقت ان تمام فلسفوں کے خلاف اعتراض ہے جو بجائے زندگی کے موت کو اپنا نصب العین رکھتے ہیں جو سب سے بڑے مانع حیات یعنی مادہ کے وجود کو نظر انداز کردیتے ہیں اور بجائے اسے تسخیر کرنے کے اس کے سامنے سے ہٹ جانے کی تعلیم دیتے ہیں۔''

اقبال کی ساری مثنوی گویا اس تصوف کا جواب ہے جس کا مطالعہ آج سے پندرہ برس پیشتر ان کا خاص مشغلہ تھا۔

کہا جاسکتا ہے کہ یہ ساری گفتگو فلسفیانہ دلچسپی کی ہے اس لئے انگریزی قوم کو اس سے کوئی دلچسپی نہیں ہوسکتی لیکن نہیں اقبال کا کلام ایک سیاسی مفہوم اور سیاسی قوت رکھتا ہے اس لئے کہ یہ شاعر باوجود انتہائی آزاد خیال حکمائے مغرب کے ساختہ پرداختہ ہونے کے ایک پرجوش مسلمان بھی ہے۔ محمدؐ اس کے پیمبر برحق اور قرآن اس کی کتاب آسمانی ہے، فطرت بشری قدیم معتقدات کو جدید لباس پہنانے پر اس قدر حریص ہے کہ یہ شاعر بھی یہ عقیدہ رکھتا ہے یا اس کا اظہار کرتا ہے کہ اس کی تعلیم بھی اسی کہنہ کتاب (قرآن) کی تعلیم کا عکس ہے اس قدامت پرستی کا محرک صرف جذبہ وطنیت ہوسکتا ہے اور اس میں شبہ نہیں کہ ہند جدید میں اقبال کی مقبولیت محض شاعری کی بناء پر نہیں بلکہ وطن دوستی کی بناء پر بھی ہے۔ فرماتے ہیں۔

درِدلِ مسلم مقام مصطفیٰ است آبروئے ما زنام مصطفیٰ است

☆

طورِ موجے از غبار خانہ اش کعبہ رابیت الحرم کا شانہ اش

اس لحاظ سے اقبال کا فلسفہ اگر چہ اصولی حیثیت سے عام ہے لیکن عملاً اس کو انہوں نے ایک گروہ کے ساتھ محدود و مختص کر دیا ہے (ان کی رائے میں) وارث تاج وتخت صرف مسلمان ہی ہو سکتے ہیں اور باقی دنیا کو یا تو ان میں جذب ہو جانا چاہیے یا فنا ہو جانا چاہیے۔ پس خودی پر زور دینے، زہد اور رہبانیت کو مٹانے اور قوت واستیلاء کی رجز خوانی کا صاف مفہوم اس قدر ہے کہ ایک وطن دوست اپنی مظلوم قوم کو مقابلہ کے لئے اُبھار اور للکار رہا ہے اقبال صاف وصریح الفاظ میں جہاد کی دعوت دیتے ہیں اور جہاد بھی کیسا بالسیف کہتے ہیں۔

قرب حق از ہر عمل مقصود دار تاز تو گردو جلالش آشکار

☆

صلح شرگرد چو مقصود است غیر گر خدا باشد غرض جنگ ست خیر

یہ سچ ہے کہ دوسرے اغراض مثلاً حب زر، حب جاہ، حب ملک گیری کے لئے انہوں نے جنگ کو ممنوع ٹھہرایا ہے، لیکن نیت خواہ کیسی ہو خالص ہو، عملی زندگی میں یہ قید بالکل بے معنیٰ ہے۔ جنگ بہر صورت جنگ ہے خواہ اس کا مقصد کچھ بھی ظاہر کیا جائے اور اب تک دنیا میں جتنی لڑائیاں ہوئی ہیں خواہ مذہبی ہوں یا غیر مذہبی، ماحصل سب کا توسیع ملک وقوت ہی رہا ہے۔ جنگ اپنی سرشت ہی کے لحاظ سے مذہب کی ضد ہے خواہ مذہب کی آر پکڑ کر اسے برپا کیا جائے اور اگر مشرق ایک بار اس پر آمادہ ہو گیا کہ اسلحہ کی قوت سے اسلام کو آزاد و متحد کر کے رہے گا تو پھر اسے سکون نہیں حاصل ہو سکتا، تاوقتیکہ یا وہ ساری دنیا کو مسخر نہ کر لے اور یا یہ کوشش ناکامی پر ختم ہو لے اور ان دونوں صورتوں میں اقبال کا فلسفہ ان کے ہم مذہبوں کے لئے کچھ زیادہ سودمند نہ ثابت ہو گا۔

ہم نے شروع میں کہا تھا کہ یہ مثنوی بطور شگون نحس کے ہے اور یہ واقعہ ہے، مغربی دنیا کے سامنے ابھی تازہ نظیر موجود ہے اور ایسی صاف نظیر جو بجز اندھوں کے (لیکن کون ایسا نہیں ہے

جو اندھا نہیں ہے) اور سب کو دکھائی دے رہی ہے کہ جنگ کے معنیٰ تمدن کے تمام شعبوں کی بربادی کے ہیں ، خصوصاً ان اعلیٰ شعبوں کی جو اقبال کے دائرہ میں آتے ہیں لیکن مغرب اس نظیر سے فائدہ اٹھانے کے لئے آمادہ نظر نہیں آتا بلکہ بعض منچلے اہل مغرب تو اپنے اہل وطن سے مایوس ہو کر مشرق سے کسی ستارہ ہدایت کے طلوع کی امید قائم کر رہے ہیں ۔ ستارہ بیشک طلوع ہوا ہے لیکن وہ ستارۂ امن وامان نہیں بلکہ یہی ستارہ ہے خونین اور اگر یہ کتاب الہامی ہے تو آخری امیدوں پر بھی پانی پڑ جاتا ہے ۔ مشرق اگر مسلح ہو گیا تو ممکن ہے مغرب کو تسخیر کر ڈالے لیکن کیا اس سے وہ فساد ہلاکت کی قوت کو بھی مسخر کر لے گا ۔ نہیں بلکہ قدیم خون ریزیاں رہ رہ کر برابر ابھرتی رہیں گی اور ساری دنیا کو مبتلائے مصائب رکھیں گی ۔ بس اس کے سوا اور کوئی نتیجہ نہیں کیا اقبال کا یہی اختتامی پیام ہے؟ ۔

☆☆☆

عالم آب و خاک و باد اسرِ عیاں ہے تو کہ میں ؟
وہ جو نظر سے ہے نہاں اس کا جہاں ہے تو کہ میں ؟
وہ شب درد و سوز و غم کہتے ہیں زندگی جسے
اس کی سحر ہے تو کہ میں ؟ اسکی اذاں ہے تو کہ میں ؟
کس کی نمود کے لیے شام و سحر ہیں گرم سیر
شانۂ روزگار پر بار گراں ہے تو کہ میں ؟
تو کفِ خاک و بے بصر میں کفِ خاک و خود نگر
کشتِ وجود کے لیے آب رواں ہے تو کہ میں ؟

گورستانِ شاہی

ڈاکٹر محمد اقبال

(۱)

آسماں بادل کا پہنے خرقۂ دیرینہ ہے کچھ مکدّر سا جبینِ ماہ کا آئینہ ہے
چاندنی پھیکی ہے اس نظارۂ خاموش میں صبح صادق سو رہی ہے رات کی آغوش میں
کس قدر اشجار کی حیرت فزا ہے خامشی بربطِ قدرت کی دھیمی سی نوا ہے خامشی
باطنِ ہر ذرۂ عالم سراپا درد ہے
اور خاموشی لب ہستی پہ آہِ سرد ہے

(۲)

آہ! جوالاں گاہِ عالم گیر یعنی وہ حصار دوش پر اپنے اٹھائے سینکڑوں صدیوں کا بار
زندگی سے تھا کبھی معمور، اب سنسان ہے یہ خموشی اس کے ہنگاموں کا گورستان ہے
اپنے سکّانِ کہن کی خاک کا دلدادہ ہے
کوہ کے سر پر مثال پاسباں استادہ ہے

(۳)

ابر کے روزن سے وہ بالائے بام آسماں ناظرِ عالم ہے نجم سبز فام آسماں
خاک بازی، وسعت دنیا کا ہے منظر اسے داستاں ناکامیِ انساں کی ہے از بر اسے
ہے ازل سے یہ مسافر سوئے منزل جا رہا آسماں سے انقلابوں کا تماشا دیکھتا
گو سکوں ممکن نہیں عالم میں اختر کے لیے فاتحہ خوانی کو یہ ٹھہرا ہے دم بھر کے لیے
رنگ و آبِ زندگی سے گل بدامن ہے زمیں
سینکڑوں خوں گشتہ تہذیبوں کا مدفن ہے زمیں

(۴)

خواب گہ شاہوں کی ہے یہ منزلِ حسرت فزا　　دیدۂ عبرت، خراجِ اشکِ گلگوں کر ادا
ہے تو گورستاں مگر یہ خاک گردوں پایہ ہے　　آہ! اک برگشتہ قسمت قوم کا سرمایہ ہے
مقبروں کی شان حیرت آفریں ہے اس قدر　　جنبشِ مژگاں سے ہے چشم تماشا کو حذر
کیفیت ایسی ہے ناکامی کی اس تصویر میں
جو اتر سکتی نہیں آئنۂ تحریر میں

(۵)

سوتے ہیں خاموش، آبادی کے ہنگاموں سے دور　　مضطرب رکھتی تھی جن کو آرزوئے ناصبور
قبر کی ظلمت میں ہے ان آفتابوں کی چمک　　جن کے دروازوں پہ رہتا تھا جبیں گستر فلک
کیا یہی ہے ان شہنشاہوں کی عظمت کا مآل　　جن کی تدبیر جہاں بانی سے ڈرتا تھا زوال
رعب فغفوری ہو دنیا میں کہ شانِ قیصری　　ٹل نہیں سکتی غنیم موت کی یورش کبھی
بادشاہوں کی بھی کشتِ عمر کا حاصل ہے گور
جادۂ عظمت کی گویا آخری منزل ہے گور

(۶)

شورشِ بزم طرب کیا! عود کی تقریر کیا　　درد مندانِ جہاں کا نالۂ شب گیر کیا
عرصۂ پیکار میں ہنگامۂ شمشیر کیا　　خون کو گرمانے والا نعرۂ تکبیر کیا
اب کوئی آواز سوتوں کو جگا سکتی نہیں
سینۂ ویراں میں جانِ رفتہ آ سکتی نہیں

(۷)

روح، مشتِ خاک میں زحمت کش بیدار ہے　　کوچہ گرد نے ہوا جس دم نفس فریاد ہے
زندگی انساں کی ہے مانند مرغِ خوش نوا　　شاخ پہ بیٹھا کوئی دم، چہچہایا، اُڑ گیا
آہ کیا آئے ریاضِ دہر میں ہم، کیا گئے　　زندگی کی شاخ سے پھوٹے، کھلے مرجھا گئے

موت ہر شاہ و گدا کے خواب کی تعبیر ہے
اس ستم گر کا ستم انصاف کی تصویر ہے

(۸)

سلسلہ ہستی کا ہے اک بحرِ ناپیدا کنار — اور اس دریائے بے پایاں کی موجیں ہیں ہزار
اے ہوس! خوں رو کہ ہے یہ زندگی بے اعتبار — یہ شرارے کا تبسم! یہ خسِ آتش سوار
چاند جو صورت گرِ ہستی کا اک اعجاز ہے — پہنے سیمابی قبا محوِ خرامِ ناز ہے
چرخِ بے انجم کی دہشتناک وسعت میں مگر — بے کسی اس کی کوئی دیکھے ذرا وقتِ سحر
اک ذرا سا ابر کا ٹکڑا تھا، جو مہتاب تھا
آخری آنسو ٹپک جانے میں ہو جس کی فنا

(۹)

زندگی اقوام کی بھی ہے یوں ہی بے اعتبار — رنگ ہائے رفتہ کی تصویر ہے ان کی بہار
اس زیاں خانے میں کوئی ملتِ گردوں وقار — رہ نہیں سکتی ابد تک بارِ دوشِ روزگار
اس قدر قوموں کی بربادی سے ہے خوگر جہاں — دیکھنا بے اعتنائی سے ہے یہ منظر جہاں
ایک صورت پر نہیں رہتا کسی شے کو قرار — ذوقِ جدت سے ہے ترکیبِ مزاجِ روزگار
ہے نگینِ دہر کی زینت ہمیشہ نام نو
مادرِ گیتی رہی آبستنِ اقوامِ نو شہ

(۱۰)

ہے ہزاروں قافلوں سے آشنا یہ رہ گزر — چشمِ کوہِ نور نے دیکھے ہیں کتنے تاجور
مصر و بابل مٹ گئے باقی نشاں تک بھی نہیں — دفترِ ہستی میں ان کی داستاں تک بھی نہیں
آ دبایا مہرِ ایراں کو اجل کی شام نے — عظمتِ یونان و روما لوٹ لی ایام نے
آہ! مسلم بھی زمانے سے یوں ہی رخصت ہوا
آسماں سے ابرِ آزادی اٹھا، برسا، گیا

(۱۱)

ہے رگِ گُل صبح کے اشکوں سے موتی کی لڑی کوئی سورج کی کرن شبنم میں ہے الجھی ہوئی
سینۂ دریا شعاعوں کے لیے گہوارہ ہے کس قدر پیارا لب جو مہر کا نظارہ ہے
محوِ زینت ہے صنوبر، جوئے بار آئینہ ہے غنچہ گل کے لیے، باد بہار آئینہ ہے
نعرہ زن رہتی ہے کوئل باغ کے کاشانہ میں چشم انساں سے نہاں، پتوں کے عزلت خانہ میں
اور بلبل، مطربِ رنگیں نوائے گلستاں جس کے دم سے زندہ ہے گویا ہوائے گلستاں
عشق کے ہنگاموں کی اڑتی ہوئی تصویر ہے خامۂ قدرت کی کیسی شوخ یہ تحریر ہے
باغ میں خاموش جلسے گلستاں زادوں کے ہیں وادی کہسار میں نعرے شباں زادوں کے ہیں
زندگی سے یہ پرانا خاکداں معمور ہے موت میں بھی زندگانی کی تڑپ مستور ہے
پتیاں پھولوں کی گرتی ہے خزاں میں اس طرح دست طفل خفتہ سے رنگیں کھلونے جس طرح

اس نشاط آباد میں یہ عیش بے اندازہ ہے
ایک غم، یعنی غم ملت ہمیشہ تازہ ہے

(۱۲)

دل ہمارے یاد عہد رفتہ سے خالی نہیں اپنے شاہوں کو یہ اُمت بھولنے والی نہیں
اشک باری کے بہانے ہیں یہ اجڑے بام و در گریۂ پیہم سے بینا ہے ہماری چشم تر
دہر کو دیتے ہیں موتی دیدۂ گریاں کے ہم آخری بادل ہیں اک گزرے ہوئے طوفاں کے ہم
ہیں ابھی صدہا گہر اس ابر کی آغوش میں برق ابھی باقی ہے اس کے سینۂ خاموش میں
وادیِ گل، خاکِ صحرا کو بنا سکتا ہے یہ خواب سے امید دہقاں کو جگا سکتا ہے یہ

ہو چکا گو قوم کی شانِ جلالی کا ظہور
ہے مگر باقی ابھی شانِ جمالی کا ظہور

☆☆☆

خالد سعید

نظم ''گورستانِ شاہی''.....ایک مطالعہ

پہلی قراءت ہی میں نظم کے جس وصف نے مجھے متاثر کیا ہے وہ اس کے پیکر اور تلازمے ہیں۔ اس نظم میں دو طرح کے پیکر' استعارے اور ان کے تلازمے پائے جاتے ہیں۔ ایک تو وہ پیکر اور استعارے ہیں جن سے خاموشی' بے حرکتی' ویرانی' بے ثباتی' فنا پذیری اور عارضی پن کی معنویت وابستہ ہے۔ تو دوسری طرح کے پیکروں' استعاروں اور ان کے تلازموں کے ساتھ حرکت' حرارت' رنگ اور آواز کی معنویت منسوب ہے۔ اس لحاظ سے نظم کو دو حصوں میں بآسانی تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ پہلا حصہ آٹھ بندوں پر مشتمل ہے جن میں مندرجہ بالا پہلی معنویت سے وابستہ پیکروں اور استعاروں کی فراوانی پائی جاتی ہے۔ باقی چار بندوں والے دوسرے حصے میں دوسری طرح کے پیکروں' استعاروں اور ان کے تلازموں کی کثرت پائی جاتی ہے۔ ہونا تو یہ چاہیے کہ ان پیکروں' استعاروں اور تلازموں کا مصرع بہ مصرع یا بیت بہ بیت جائزہ لیا جاتا تو نظم سے حظ اندوزی اور اس کی معنویت کی تفہیم کے امکانات بڑھ جاتے لیکن طوالت کے سبب گراں گزرنے کا خدشہ بھی ہے۔ لہٰذا اہم اہم پیکروں' استعاروں اور ان کے تلازموں کے مطالعے ہی پر اکتفا کرنے کو احسن جانتا ہوں۔ اس نظم کے کلیدی پیکر اور استعارے حسب ذیل ہیں:

☆ رات' پھیکی چاندنی' نجم مسافر ازل' خموش اشجار' ویران و تاریک قلعہ' گورستان' مزاریں' قبور کی ظلمت' مرغ چمن' تابناک صبح

میں نے مطالعہ کی سہولت کی خاطر' نظم کے پہلے حصے میں پائے جانے والے پیکروں' استعاروں اور ان کے تلازموں کو ان کی معنویت اور کیفیت کی بنیاد پر دو زمروں میں بانٹ دیا ہے جو حسب ذیل ہیں:

الف۔ خاموشی' بے حرمتی اور ویرانی کی معنویت:

☆ رات' پھیکی چاندنی' نجم سبز فام آسماں' چرخِ بے انجم' خموش اشجار' وسعت دنیا

کے حامل پیکر/استعارے/تلازمے

گل بدامن زمین، تہذیبوں کا مدفن زمین

☆ حصار، گورستان، خواب گہہ، مدفن، قبور، تصویر رفتہ، آئینہ تحریر

آپ نے ملاحظہ فرمایا ہوگا کہ اوپر بیان کردہ تراکیب واستعاروں میں بھی دو طرح کے تلازمے اور پیکر پائے جاتے ہیں۔ ایک تو وہ ہیں جو اقبال نے فطرت (نیچر) سے اخذ کیے ہیں تو دوسرے وہ ہیں جو انسانی سرگرمیوں سے تعلق رکھتے ہیں، چُن لیے ہیں مثلاً حصار، گورستان، خواب گہہ وغیرہ۔

ب۔ بے ثباتی، فنا پذیری اور ناپائیداری جہاں کی:

☆ غنیم موت، ظلمت قبر، نجم مسافر ازل کا فاتحہ خوانی کے لیے پل بھر ٹھہرنا،

معنویت کے حامل پیکر/استعارے/تلازمے

نَفَسِ نے کی آمد و رفت، مرغ خوش نوا کا چہکنا اور اڑ جانا،

مہتاب کا آنسو بن کے ٹپک جانا، زیاں خانہ، شرارے کا تبسم، خس آتش سوار،

بربادی کا خوگر جہاں، گور، مدفن زمین، تہذیبوں کا مدفن

شاخ حیات سے پھولوں کا جھڑنا

اگرچہ میں نے محولہ بالا پیکروں اور استعاروں اور ان کے تلازموں کو اپنے مطالعے کی سہولت کی خاطر دو علاحدہ زمروں میں تقسیم کیا ہے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ انھیں علاحدہ کرنا ان کی معنویت اور تاثیر میں تخفیف کا باعث ہوگا، دراصل یہ دونوں نوعیتوں کے استعارے اور پیکر نہ صرف معنوی وحدت کا سبب ہیں بلکہ تاثیر آفرینی کا باعث بھی ہیں۔ ایسا نہیں کہ نظم کے پہلے حصے میں صرف اور صرف خاموشی، ویرانی، بے حرکتی، بے ثباتی، فنا پذیری اور ناپائیداری کی معنویت سے وابستہ پیکر، استعارے اور ان کے تلازمے پائے جاتے ہیں بلکہ آواز، رنگ، نور اور حرارت سے معمور یعنی زندگی سے معمور پیکر و استعارے اور ان کے تلازمے بھی پائے جاتے ہیں لیکن عجیب بات یہ ہے کہ اپنی انتہائی معنویت میں وہ بھی خاموشی، ویرانی، بے ثباتی، فنا پذیری کی معنویت کو مستحکم کرتے نظر آتے ہیں۔ مثلاً:

☆ بربط قدرت کی دھیمی آواز ☆ لب ہستی پہ آہ سرد ☆ انجم مسافر ازل

☆ دنیا کی خاک بازی ☆ جولاں گہہ عالم گیر ☆ شورش بزم طرب
☆ نالۂ شب گیر ☆ ہنگامۂ شمشیر ☆ نعرۂ تکبیر ☆
گل بدامن زمیں ☆ تہذیبوں کا مدفن زمیں

اگر چہ یہ سارے پیکر، یہ سارے استعارے حرکت وحرارت، معموری وسیاری کے تصور سے مملو ہیں لیکن اقبال نے انھیں اپنے ہنروفن سے ان کی معنویت منقلب کردی ہے۔ یعنی انھیں بھی سکوت وسکون میں بدل دیا ہے۔ مثلاً نظم کا دوسرا بند ملاحظہ فرمایئے:

آہ جولاں گاہِ عالم گیر، یعنی وہ حصار — دوش پر اپنے اٹھائے سیکڑوں صدیوں کا بار
زندگی سے تھا کبھی معمور، اب سنسان ہے — یہ خموشی اس کے ہنگاموں کا گورستان ہے
اپنے سُکان کہن کی خاک کا دلدادہ ہے
کوہ کے سر پر مثال پاسباں استادہ ہے

اقبال نے حصار کو (مراد گولکنڈے کا قلعہ) جولان گاہِ عالم گیر قرار دیا ہے۔ چوں کہ اورنگ زیب عالم گیر نے گولکنڈے کو فتح کیا تھا، اس رعایت سے گولکنڈے کو جولان گاہ عالم گیر سے تعبیر کیا ہے۔ (یہ الگ بحث کہ اقبال نے قلعہ گولکنڈے کو قطب شاہوں کے واسطے سے یاد کرنے کی بجائے عالم گیر کے واسطے سے کیوں یاد کیا۔ اس پر اظہار خیال آگے کیا جائے گا)۔ جولاں گاہ کے تلازمے کے ساتھ ہی ہمارا تصور حرکت وعمل، شور وشر، تلواروں کی جھنکار، اور چیخوں کے تاثرات سے بھر جاتا ہے۔ لیکن اگلے مصرعے ''دوش پر اپنے اٹھائے سینکڑوں صدیوں کا بار'' اٹھائے کھڑے رہنے کے پیکر کے سبب جنبش وحرکت کا تاثر معدوم ہونے لگتا ہے اور آگے کے اشعار میں پائے جانے والے واضح اعلانات یعنی ''زندگی سے تھا کبھی معمور اب سنساں ہے'' اور ''ہنگاموں کا گورستان ہے'' یعنی 'سنسان' کے تلازمے اور 'گورستان' کے پیکر کے باعث بچا کُچھا آواز ورنگ اور شور وشر کا نقش بھی محو ہو جاتا ہے۔ یہی حال ان مصرعوں کا ہے:

بربط قدرت کی دھیمی سی نوا ہے خامشی
اور خاموشی لب ہستی پہ آہِ سرد ہے

اقبال کا ہنر دیکھیے کہ ایک مصرعے میں بربط کی دھیمی نوا کو خاموشی قرار دیا ہے تو دوسرے

مصرعے میں خاموشی کو لبِ ہستی پہ آہ سرد سے تعبیر کیا ہے۔ اس قول محال کا حاصل۔ خاموشی

رنگ و آبِ زندگی سے گل بدامن ہے زمیں
سینکڑوں خوں گشتہ تہذیبوں کا مدفن ہے زمیں

'گل بدامن' کے بصری پیکر سے رنگینی اور خوش نمائی کا احساس تو ضرور ہوتا ہے لیکن حرکت کا نہیں۔ رنگینی کا یہ احساس بھی تاسف اور ملال کی کیفیت میں اس وقت بدل جاتا ہے جب شاعر کے بیان سے ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ یہ رنگینی وخوش نمائی دراصل گذشتہ تہذیبوں کے خون کے دھبے ہیں جو دامنِ گیتی پر لگے ہیں کہ زمین تو سینکڑوں تہذیبوں کا مدفن ہے۔

قبر کی ظلمت میں ہے یہ آفتابوں کی چمک
جن کے دروازوں پہ رہتا تھا جبیں گستر فلک

سلاطین قطب شاہی کے آگے فلک کی جبیں گستری کے حرکی پیکر کی وجہ سے عظمت کا جو نقش قاری کے ذہن ودل پر مرتسم ہورہا تھا کہ ''قبر کی ظلمت میں ان آفتابوں کی چمک کھو جانے'' کے پیکر اور صنعت' تضاد کے استعمال سے ویرانی اور ناپائیداری کا تاثر کچھ اور گہرا گیا ہے اور عظمت کا نقش عبرت میں بدل جاتا ہے۔ چھٹے بند میں آرزوئے ناصبور رکھنے والے اس طرح سوئے کہ ان کے لیے 'سوزش بزم طرب' نمود کی تقریر'' نالۂ شب گیر'' ''ہنگامۂ شمشیر'' اور ''نعرۂ تکبیر''..... ان سب کی صدائیں خاموشی میں بدل جاتی ہیں۔ دراصل اقبال نے محولہ پیکروں کے ساتھ ایک لسانی حربے یعنی استفہامیہ نفی 'کیا' کو ملحق کر کے ان شور مچاتے پیکروں کو بھی خاموش کر دیا ہے۔ غرض اقبال نے کہیں صنعتوں کے استعمال (تضاد وتقابل) سے تو کہیں بیان کے ٹوٹکوں (قول محال) کے ذریعے اور کہیں لسانی حربوں (استفہامیہ نفی) کی مدد سے حرکی وسمعی پیکروں اور استعاروں کی معنویت اور کیفیت کو منقلب کر دیا ہے۔ لہٰذا نظم کے ایک ایک لفظ سے' ایک ایک پیکر واستعارے سے اور ایک ایک تلازمے سے۔ بے پناہ خاموشی' اتھاہ ویرانی اور تاسف وملال ٹپکتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ ویرانی سنگین تر تو ناپائیداری جہاں اور فنا پذیری کا احساس شدید ترین ہو جاتا ہے۔ گورستان شاہی کی زیارت سے' شاید اقبال جس ویرانی' جس ملال سے گزرے ہوں گے' اس کے اظہار میں نہ صرف کامیاب رہے بلکہ اس کرب وبلا کو اس تاسف وعبرت کو قاری کے باطن میں اس کے ذہن ودل سے منتقل کرنے میں بھی کامیاب ٹھہرے۔

یہ تو تھی نظم کے پہلے حصے کی کیفیت' لیکن نظم کے دوسرے حصے میں اس کے برعکس کیفیت

پائی جاتی ہے۔ نظم آٹھویں بند سے اپنا موڈ بدلنے لگتی ہے۔ نظم کے دوسرے حصّے میں حرکت وحرارت، تغیّر وتبدّل اور معموری وشادابی سے وابستہ پیکروں، استعاروں اوران کے تلازموں کی کثرت نظر آتی ہے۔ ذرا ان پیکروں اوراستعاروں کوملاحظہ فرمایئے:

الف۔ شادابی وآبادی کی معنویت سے :

شبنم سے الجھی ہوئی صبح کی کرن، رگ گل سے لپٹی ہوئی شبنم کی لڑی،

وابستہ پیکر/استعارے/تلازمے وغیرہ

دریا: شعاؤں کا گہوارہ، لب مہر جو کا نظارہ، نہر کے آئینے کے آگے محوآرائش صنوبر

غنچۂ گل کے لیے باد بہاری کا آئنہ، کوئل کی نعرہ زنی، بلبل کی رنگیں نوائی

عشق کے ہنگامے، گلستاں زادوں کے جلسے، نشاط آباد

ب۔ تغیّر وحرکت سے معمور پیکر :

کسی شے کو قرار نہیں، ذوقِ جدت، مزاجِ روزگار، مادر گیتی: آبستن اقوام نو

استعارے، تلازمے وغیرہ

قافلہ آشنا رہ گزار، نشاط آباد، کہنہ خاکداں کی معموری، سینۂ خاموش میں لپکتی برق

وادی گل میں تبدیل ہوتی خاکِ صحرا ، موت میں بھی زندگی کی تڑپ

دیکھا آپ نے نظم نے کس طرح اپنا رنگ وروپ بدل لیا ہے۔ پہلے حصّے میں موت کی خاموشی تھی تو دوسرے حصّے میں زندگی کی ہمہ ہمی پائی جاتی ہے۔ کہاں وہ خاموشی اور سنسان پن کہاں یہ صوت وصدا کے ہنگامے۔ کہاں وہ بے کیف وکثیف اجالا، کہاں یہ تابناک زندہ صبح، کہاں وہ اضمحلال اور پژمردگی، کہاں یہ شادابی وتازگی، کہاں وہ سکوت وسکون کہاں یہ تغیّر وتبدّل ۔ اگرچہ نظم کے دونوں حصّے ایک دوسرے کے مخالف ومتخالف ہیں، اور متضاد اور متغائر کیفیات و معنویت کے حامل بھی ہیں، اس کے باوجود وہ ایک دوسرے کو Suppliment کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ تب قاری کے دل میں یہ سوالات آتے ہیں:

☆ کیا یہ نظم واقعتاً درست ہے؟

☆ کیا اقبال نے گورستان شاہی اور اس کے مناظر سے تحریک پا کے نظم خلق کی ہے یا اپنی فکر یا تصور کے اظہار کے لیے گورستان شاہی کو عموماً اور اس کے مناظر کو خصوصاً ذریعہ بنایا ہے؟

ہمارے ان دونوں سوالوں کا جواب اقبال کے اس مختصر نوٹ سے مل جاتا ہے جو رسالہ 'مخزن' کے جون ۱۹۱۰ء کے شمارے میں نظم کے ساتھ شائع ہوا ہے۔ لکھتے ہیں:

> ''مجھے ایک شب ان شاندار مگر حسرت ناک گنبدوں کی زیارت کے لیے لے گئے۔ جن میں سلاطین قطب شاہیہ سو رہے ہیں۔ رات کی خاموشی' ابر آلود آسمان اور بادلوں سے چھن کر آتی ہوئی چاندنی نے اس پر حسرت منظر کے ساتھ مل کے میرے دل پر ایسا اثر کیا جو کبھی فراموش نہ ہوگا۔''

اقبال کے اس نوٹ سے صاف ظاہر ہے کہ گورستان شاہی سے تحریک پا کر انھوں نے یہ نظم خلق کی اور نظم کے پہلے حصے میں کم وبیش ایسا ہی نظارہ پایا جاتا ہے جیسا کہ انھوں نے نظم گورستان شاہی میں بیان کیا ہے۔ اقبال کا یہ نوٹ ان شارحین کے لیے مسکت جواب ہے' جن کا خیال ہے کہ اقبال نے تھامس گرے کی ایلجی سے متاثر ہو کے یہ نظم کہی ہے۔ اس نوٹ سے بظاہر تو میرے قائم کردہ سوالوں کا جواب مل چکا ہے لیکن مکمل جواب نہیں۔ اقبال کے محولہ بالا نوٹ سے یہ پتہ نہیں چلتا کہ کیا انھوں نے ساری رات گنبدان قطب شاہی میں گزاری اور صبح کا منظر بھی دیکھا؟ کیا وہ صبح بھی ویسی ہی تھی جیسی کہ نظم میں پیش کی گئی ہے۔ نظم کے مطالعے کے پس منظر میں' میرا یہ سوال بظاہر اٹپٹا سا لگتا ہے' لیکن ہے جڑا ہوا۔ فرض کیجیے' اقبال نے وہ صبح نہ دیکھی ہو' یعنی کہ نظم میں پیش کردہ صبح کا منظر اقبال کا گڑھا ہوا ہے' تو کیا نظم کی معنویت یا اہمیت میں کمی واقع ہو جائے گی؟ مجھے عرض کرنا یہی تو ہے کہ کسی فن کار کی عظمت اور فن پارے کی معنویت اور اہمیت' اس میں بیان کردہ واقعات کی صحت یا عدم صحت پر منحصر نہیں ہوتی۔ بلکہ ان کے تخلیقی جواز پر منحصر ہوتی ہے۔ مثلاً اقبال کے اس شعر پر:

بے خطر کود پڑا آتش نمرود میں عشق
عقل ہے محو تماشائے لب بام ابھی

رسالہ ''الرسالہ'' کے مدیر مولانا وحید الدین خان کو یہ اعتراض ہے کہ یہ شعر واقعتاً درست نہیں ہے کہ حضرت ابراہیم' لفظ عشق جن کا استعارہ ہے' خود سے آگ میں نہیں کودے تھے بلکہ انھیں آگ میں ڈالا گیا تھا۔ اب انھیں کون سمجھائے کہ ادب نام ہی ہے Recreation of Realities کا۔ یعنی واقعات کی بازتخلیقیت کا۔ اقبال لاکھ اعلان کریں کہ وہ شاعر نہیں ہیں لیکن ہیں تو وہ فن کار ہی۔ ان کی تخلیقات میں واقعات جوں کا توں پیش نہیں کیے جاتے۔ وہ کوئی رہنما یا ہادی تو ہیں نہیں کہ جو بھی کہیں گے سچ کہیں گے اور سچ کے سوا کچھ نہ کہیں گے۔ بات یہ ہے کہ اقبال نے اپنی تخلیقات میں واقعات کی بازتخلیق کی ہے۔ اپنی فکر' اپنے تصورات کے مطابق حقائق کو ڈھالا ہے تاکہ تصوارت کی معنویت بھی باقی رہے اور فن کی آبرو بھی۔ مثلاً اسی نظم کے صبح کے منظر کو لیجیے' وہ حقیقی ہو کہ غیر حقیقی' وہ واقعتاً ہو کہ تخیلی (بلکہ داخلی شہادتوں کی بنا پر اس کے تخیلی ہونے کا قیاس اغلب ہے) لیکن نظم کی معنویت کی تکمیل اور اقبال کے تصورات کی ترجمانی کا موجب ہے۔ یعنی نظم کے پہلے حصّے (رات کا بیان) اور نظم کے دوسرے حصّے (صبح صادق کا بیان) میں پائے جانے والی تضاد اور مغائرت کی رعایت نہ صرف نظم کی منطقی تکمیل کا جواز فراہم کرتی ہے بلکہ نظم کی کیفیت کو دو چند کرتی ہے اور اقبال کے تصور حیات اور وقت کی ترجمانی کا سبب بھی ٹھہرتی ہے۔ میں اپنی بات کو نظم کے مزید حوالوں کی مدد سے شاید واضح کر سکوں۔ مثلاً حسب ذیل اشعار کو' جو نظم کے پہلے حصّے اور دوسرے حصّے سے لیے گئے ہیں' جن میں اس نظم کے کلیدی پیکر اور استعارے پائے جاتے ہیں' جیسے شب' صبح صادق' زمین' گورستان' نجم/اختر صبح' طیور اور اشجار وغیرہ:

پہلا حصّہ	دوسرا حصّہ
تیسرا بند: رنگ و آب زندگی سے گل بدامن ہے زمیں	ہے نگینِ دہر کی زینت ہمیشہ نامِ نو (نواں بند)
سینکڑوں خوں گشتہ تہذیبوں کا مدفن ہے زمیں	مادر گیتی رہی آبستن اقوام نو
ساتواں بند:	اور بلبل' مطرب رنگیں نوائے گلستاں
زندگی انساں کی ہے' مانندِ مرغ خوش نوا	(اداواں بند)
شاخ پہ بیٹھا کوئی دم' چہچہایا' اُڑ گیا	جس کے دم سے زندہ ہے گویا ہوائے گلستاں

پہلا بند

کس قدر اشجار کی حیرت فزا ہے، خامشی
بربطِ قدرت کی دھیمی سی نوا ہے، خامشی

محو زینت ہے صنوبر، جوئے بار: آئینہ ہے
(اواں بند)

غنچۂ گل کے لیے باد بہار، آئینہ ہے

چوتھا بند:

ہے تو گورستاں، مگر یہ خاک گردوں پایہ ہے
آہ، اک برگشتہ قسمت قوم کا سرمایہ ہے

اس زیاں خانے میں کوئی ملت گردوں وقار
(نواں بند)

رہ نہیں سکتی ابد تک بار دوش روزگار

اس تقابل سے جہاں ناپائیداری حیات اور بے اعتباریِ جہاں کا نقش گہرا ہو جاتا ہے وہیں حیات کے تسلسل اور اس کے جاری و ساری رہنے کا نقش بھی اتنا ہی گہرا ہو جاتا ہے۔ یہ سبق ملتا ہے کہ ناپائیداری حیات ہی عین حیات ہے اور موت حیات کے تسلسل کا موجب ہے۔

ایک صورت پہ نہیں رہتا کسی شے کو قرار
ذوق جدّت سے ہے ترکیب مزاج روزگار

یہی اقبال کا عندیہ بھی ہے۔ اقبال نے کمال یہ کیا ہے کہ جن پیکروں اور تلازموں کی مدد سے ناپائیداریِ حیات اور بے اعتباریِ جہاں کا نقش قائم کیا ہے، نظم کے دوسرے حصّے میں انھی پیکروں، استعاروں اور تلازموں کی مدد سے معموریِ کائنات، آبادیِ جہاں اور تسلسل حیات کا نقش بھی ابھارا ہے۔ مثلاً یہ زمین اقوام گذشتہ کا مدفن ہے تو یہی زمین اقوام آئندہ کو جنم بھی دیتی ہے۔ مصرع ''مادر گیتی رہی آبستن اقوام نو'' پر ذرا غور فرمایئے: اقبال نے مادر گیتی، کی رعایت سے زمین کے لیے ''آبستن اقوام نو'' کی ترکیب وضع کی ہے کہ یا ''آبستن اقوام نو'' کی ترکیب کے لحاظ سے مادر گیتی کی اصطلاح وضع کی ہے، فیصلہ کرنا مشکل ہے یا پھر اقبال کے تخلیقی شعور نے نظم کے پہلے حصّے کے مصرعے ''سینکڑوں خوں گشتہ تہذیبوں کا مدفن ہے زمیں'' کے جواب میں ''مادر گیتی رہی آبستن اقوام نو'' جیسا بلیغ تصور خلق کیا ہے، کہنا مشکل ہے۔ یہی حال ان پیکروں کا بھی ہے۔ مثلاً اشجار، جہاں ابتدائی بند میں خاموشی اور ویرانی کی معنویت اور کیفیت کو مستحکم کرتے ہیں وہیں وہ نظم کے دوسرے حصّے میں ندی کے آئینے کے آگے کھڑے محو آرائش بھی ہیں۔ ان کی گل پیرہنی فروغ پا رہی ہے۔ ایک طرف جہاں انسانی زندگی کو پل بھر میں چہک کے اڑ جانے والے پرندے سے استعارہ کیا گیا ہے، تو دوسری طرف اسی مرغ چمن کو زندگی کا کنایہ بھی کیا گیا ہے کہ اس کی

رنگیں نوائی سے گلستاں بھی چہک اٹھتا ہے۔ یہ فیصلہ کرنا مشکل ہے کہ اقبال نے پہلے کے جواب میں دوسری طرز کا مصرع خلق کیا ہے اور دوسرے مصرع کو پہلے کا سبب جانا ہے۔ ہمارے لیے یہ مشکل ہے کہ سبب کو مسبب ٹھہرائیں یا مسبب کو سبب کا نتیجہ قرار دیں۔ لیکن اتنا ضرور کہا جا سکتا ہے' ان مخالف و مغائر معنویت کے حامل پیکروں اور استعاروں کی وجہ سے نظم کے دونوں حصّوں میں ایک عجیب سا ربط قائم ہو جاتا ہے' جو تضاد اور قولِ محال پر استوار ہے۔

اب ذرا ''نجم سبز فام آسماں'' پر ایک نظر ڈال لیں۔ اقبال کے مطابق یہ تو مسافر ازلی ہے جو گورستانِ شاہی پر فاتحہ خوانی کے لیے پل بھر کو چرخ نیلی فام میں ٹھہر گیا ہے۔ جسے انسانوں کی ناکامی کی داستانیں ازبر ہیں کیوں کہ وہ ان کا شاہد ہے۔ جس کے آگے دنیا خاک بازی میں مصروف نظر آتی ہے۔ وہ جو غالب نے دنیا کو بازیچۂ اطفال کہنے پر اکتفا کیا تھا' اقبال ایک قدم اور آگے بڑھ کر دنیا کو دھول میں اٹے' مٹی سے کھیلنے والے بچے سے استعارہ کر کے انجم' کی علامتی معنویت کی طرف ہماری رہنمائی کی ہے۔ اس نجمِ نیلگوں آسماں کے متعلق اقبال کی بیان کردہ اس تفصیل کے بعد بھی کیا مجھے یہ اعلان کرنا ضروری ہوگا کہ اقبال نے وقت کو نجم سبز فام آسماں سے استعارہ کیا ہے بلکہ علامت بنایا ہے۔ یہ وقت ہی تو ہے جو خاکِ تہہ نشیں کو گردوں پایہ کرتا ہے تو کبھی فلک کو شہنشاہوں کے آگے ماتھا ٹیکنے پر (جبیں گستری) مجبور کرتا ہے۔ یہ وقت ہی تو ہے جو شہنشاہوں کے چمکتے ہوئے آفتابوں کو قبور کے ظلمت کدے میں بجھا دیتا ہے اور اپنی اس فتح پر مفتوحین کی قبور کے آگے فاتحہ خوانی کے لیے پل بھر کو ٹھہر بھی جاتا ہے۔ ذرا اس پیکر کی بلاغت پر غور فرمایئے: فاتح کا اپنے مفتوح کی قبر پر فاتحہ خوانی کرنا' جہاں یہ پیکر بظاہر اخلاقی برتری کا مظہر ہے وہیں فاتح کی بے پناہ قوت و برتری کا اعلان اور قدرے تحقیر آمیز احترام کی معنویت کا بھی حامل ہے۔ لکھنے کو تو ''تحقیر آمیز احترام'' لکھ دیا لیکن حقیقتاً یہ فیصلہ کرنا مشکل ہے کہ اسے فاتح کا احترام سمجھیں' یا احترام کا ڈھونگ یا برتری کا اعلان یا محض تحقیر۔ مجھے بے ساختہ سریندر پرکاش کے افسانے 'بجوکا' کی یاد آئی۔ جب افسانے کا ہوری' پنچ کے مرعوبیت آمیز فیصلے کے سبب کھچیوں سے بنے ہوئے لکڑی کے حقیر پیکر بجوکا سے ہار جاتا ہے' اور اپنی جان دیتا ہے۔ تب وہ بجوکا اپنے سر سے انگریزوں کی ٹوپی اتار کر بغل میں دابے ہوری کی نعش کے پاس احتراماً کھڑا رہتا ہے۔ قاری کے لیے یہ فیصلہ کرنا مشکل ہو جاتا ہے کہ مرنے والے کے تئیں اسے بجوکا کا احترام سمجھیں یا

احترام کا ڈھونگ یعنی تحقیر۔ غرض وقت ہی کے اشارے پر یہ زمین تہذیبوں کو گلگ لیتی ہے تو اسی کے حکم پر نئی تہذیبوں اور نئی ملتوں کے جنم کا سبب بھی بنتی ہے یہی تو اس دہر کا مزاج ہے۔

ایک صورت پر نہیں رہتا کسی شئے کو قرار
ذوق جدّت سے ہے ترکیب مزاج روزگار

تغیر و تبدل ہی زمانے کی' دہر کی فطرت ہے لہٰذا ملتوں کا عروج و زوال' تہذیبوں کا الٹ پھیر لازمی و لابدی ہے۔ اس موقع پر اقبال کی نظم ''مسجد قرطبہ'' کا ذکر بے محل نہ ہوگا۔ واقعہ یہ ہے کہ اقبال نے اپنے کلام میں جن مقامات و عمارات کا ذکر کیا ہے' ان میں مسجد حرام' روضۂ اقدس' مسجد اقصیٰ' میدان کربلا' ہسپانیہ کی رزم گاہیں' مسجد قرطبہ' مسجد قوت الاسلام اور گورستان شاہی وغیرہ شامل ہیں۔ ان میں سے بیشتر کا ذکر صرف اشعار میں کیا ہے تو کبھی بعضوں کو اپنی نظموں کا موضوع بنایا ہے' اپنے کسی تصور کی وضاحت کے لیے انھیں تشبیہاً' استعاراً یا تمثیلاً استعمال کیا ہے۔ نظم ''مسجد قرطبہ'' اور ''گورستان شاہی'' میں کچھ اشتراک تو کچھ امتیازات بھی پائے جاتے ہیں۔ مثلاً وقت کی بربریت اور فعالیت کا تصور' ہر دو نظموں میں مشترک ہے:

آنی و فانی تمام معجزہ ہائے ہنر — کار جہاں بے ثبات' کار جہاں بے ثبات
اوّل و آخر فنا' باطن و ظاہر فنا — نقشِ کہن ہو کہ نو' منزلِ آخر فنا

فرق یہ ہے کہ وقت کی تبہ کاری اور اس کی فعالیت کا احساس ''مسجد قرطبہ'' کے پہلے بند اور وہ بھی بند کے آخری تین مصرعوں میں پایا جاتا ہے۔ جب کہ ''گورستان شاہی'' میں یہی مضمون سات بندوں تک کھچ گیا ہے۔ جس کی وجہ سے فناپذیری اور بے اعتباریِ جہاں کا تاثر شدید تو حزن و ملال کا رنگ گہرا ہو گیا ہے بلکہ درس عبرت کا موجب بن گیا ہے۔ دوسرا نمایاں فرق مسجد قرطبہ میں وقت کے بے پناہ سیل پر قابو پانے والی قوت یعنی عشق کا ذکر ملتا ہے۔ بقول اقبال یہی وہ قوت ہے جس کی مدد سے حیات کی معنویت کو برقرار رکھا جا سکتا ہے۔ جب کہ گورستان شاہی میں اس طرح کی کسی قوت کا بیان نہیں ملتا۔ بلکہ وقت ہی کو چارہ گر بنایا گیا ہے۔ یعنی وقت ہی تسلسل حیات بھی ہے۔ جس کے سبب زیاں اور عبرت کا احساس شدید ہو جاتا ہے۔ احساس کا یہ فرق مکانیت کے فرق کے سبب سے بھی ہے۔ کیوں کہ ایک مسجد ہے تو ایک گورستان۔ ایک جائے عبادت ہے تو

ایک جائے عبرت۔ ایک جمال کا پیکر ہے تو ایک شکست جلال کا پیکر۔ ایک خیر کا نقش ہے تو ایک عدم خیر یعنی قوت، محض قوت کا۔ لہٰذا نتائج کا فرق تو ہوگا ہی۔

ہو چکا قوم کی شان جلالی کا ظہور ہے مگر باقی ابھی شانِ جمالی کا ظہور

جناب غلام رسول مہر نے ''شرح بانگِ درا'' میں یوں شرح کی ہے:

''اقبال نے آخری بند میں اپنے خاص انداز کے مطابق امید کا پیغام دیا ہے اور یہ خوش خبری سنائی ہے کہ مسلمان کے شان وشکوہ اور بے اندازہ فتوحات کا دور اگرچہ گزر چکا ہے، لیکن اسلام کی معنوی خوبیاں نمایاں کرنے کا دور ابھی باقی ہے۔ مایوس نہ ہونا چاہیے۔ اس نئے دور کو وہ شان جمالی کا دور کہتے ہیں۔ اس سے غالباً مراد یہ ہے کہ زمانہ اب ذہنی اور دماغی اعتبار سے اس درجے کو پہنچ گیا ہے، جس میں وہ اسلام کی خوبیوں کا صحیح اندازہ کر سکے گا۔ اور دین حق کی برکتوں سے دنیا کا گوشہ گوشہ بقعہ نور بن جائے گا۔''

واللہ اعلم بالصواب: اتنا ضرور کہا جا سکتا ہے کہ 'مسجد قرطبہ' اور 'گورستان شاہی' کے مطالعے سے یہ تاثر ملتا ہے کہ وہ مقامات ہوں کہ عمارات، وہ افراد ہوں کہ اقوام، وہ اقوال ہوں کہ اعمال، وہی باقی رہتے ہیں جو جمال اور خیر کی قدر کے حامل ہوتے ہیں۔ اور جن میں یہ دو عناصر نہیں پائے جاتے وہ جلال کے حامل تو ہو سکتے ہیں لیکن زیاں ان کا مقدر ہے کہ جمال کی قدر ہی باقی و جاری رہنے والی ہے۔ فرحت ومسرت عطا کرنے والی ہے۔ چاہے اقبال نے گورستان شاہی کی صبح دیکھی ہو کہ نہ دیکھی ہو، نظم کے آخری چار بندوں میں بیان کردہ واقعات صحیح ہوں کہ نہ ہوں، اقبال نے آخری تین بند لکھ کے جہاں اپنے تصور وقت کو پیش کیا ہے وہیں نظم کے ابتدائی سات بندوں کے مطالعے سے پیدا ہونے والے احساس زیاں کی تلافی بھی کر دی ہے، جس کے سبب نظم متوازن اور تہہ دار ہوگئی ہے اور آخری شعر لکھ کے جہاں انھوں نے اپنے تصور حیات کی فلسفیانہ توضیح کی ہے وہیں اپنی فن کاری کا مہر بھی ثبت کیا ہے۔ لاریب اقبال ایک فن کار ہیں۔ چاہے وہ لاکھ اعلان کریں: ''مری نوائے پریشاں کو شاعری نہ سمجھ۔''

☆☆☆

رشید احمد صدیقی

کچھ اقبال کے بارے میں

''سالِ اقبال'' (۱۹۷۷ء) نے سب سے بڑا اور پہلا دل خراش، اندوہناک اور سنگین خراج ہم سے رشید احمد صدیقی کی صورت میں لیا۔ اس سال جنوری کے وسط میں رشید صاحب واصل بحق ہوئے وہ عمر میں اقبال سے پندرہ برس چھوٹے تھے، اقبال تیس برس کے نوجوان تھے جب پہلی بار رشید صاحب ان کے نام سے آشنا ہوئے اور پھر اقبال کے جیتے جی اور مابعد تا آخر وہ برابر اقبال کے معترف، مداح، مبصر و مفسر اور معتقد و مبلغ رہے۔ اس طرح کوئی ستر برس تک اقبال کی شخصیت، تعلیمات اور ان کے فکر و فن کی عظمت کا تذکرہ ان کے وردِ زبان رہا۔ اب جس کے خوشگوار اثرات و احسانات کا اندازہ لگانا بھی آسان نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ان ستر برسوں میں علی گڑھ سے ابھرنے والا شعر و ادب کا کوئی آفتاب و ماہتاب ایسا نہیں ہوگا اقبال کو جس کی متاع بنانے میں، رشید صاحب کا فیض اور تصرف کسی نہ کسی درجے میں شامل نہ رہا ہو۔

رشید احمد صدیقی نے اقبال پر بہت کچھ کہا اور لکھا۔ اقبال سے متعلق ان کی تحریروں کا ایک مجموعہ اقبال شخصیت اور شاعری، کے نام سے چھپ بھی چکا (اقبال اکادمی پاکستان صفحات ۱۴۳، بمناسبت جشن صد سالہ، نومبر ۱۹۷۷ء لیکن اقبال پر یہ رشید صاحب کی جمیع اور جملہ تحریروں پر حاوی نہیں۔ اقبال پر رشید صاحب کی ایسی بہت سی قیمتی تحریریں ہیں جو رشید صاحب کے متذکرہ مجموعہ مضامین میں شامل نہیں۔ ایسی ہی ایک نادر تحریر قارئین نقوش کی نذر کی گئی تھی جو یہاں ریویو میں پیش کی جا رہی ہے۔ (ادارہ)

اقبال کے اشعار میں موسیقی کے جتنے ''تازہ بہ تازہ نو بہ نو'' نمونے ملتے ہیں وہ اردو کے

دوسرے شعراء کے کلام میں شاید نہ ملیں اقبال غالباً اس کا التزام بھی رکھتے تھے۔ الفاظ اور فقروں کے انتخاب، ان کی ترکیب وترنم، موقع ومحل، معنیٰ ومفہوم میں اس کے شواہد ملتے ہیں لیکن اس التزام میں آورد کا شائبہ نہ ملے گا یا آورد، آمد معلوم ہوگی جو انشاء پردازی کا کمال سمجھا جاتا ہے ایسا بھی محسوس ہوا ہے جیسے شاعر نہیں، خود شعر اس اہتمام کا متقاضی تھا، یہ معمولی درجے کے شاعر کے بس کی بات نہیں۔ اس صدی کے شروع میں جب ہمارے بیشتر شعراء شاعری میں تکلفاتِ بے جا کو اتنا شاعری کا نہیں جتنا اپنا کارنامہ سمجھتے تھے اور اسی طرح کے بندھے ٹکے سامعین سے داد حاصل کرتے تھے۔ اقبال کی یہ آواز اور انداز بہت مفید ثابت ہوا۔

موسیقی آواز کی تنظیم ہے، اشعار کی دروبست (اوزان) موسیقی کی دین ہے۔ شاعر کے لئے شاعری کے لئے موزوں فریم موسیقی ہی فراہم کرتی ہے۔ موسیقی کو جو تب وتاب اور تاثیر آلاتِ موسیقی سے ملتی ہے اس سے کچھ زیادہ نہیں تو کم بھی نہیں۔ شاعری سے ملتی ہے۔ موسیقی موزوں اور مقررہ آواز ہے اور آواز کی زبان شاعری، موسیقی اور شاعری کا قران السعدین اور دونوں علاحدہ علاحدہ بھی انسان کے بخشے ہوئے وہ کارنامے اور کرامات ہیں جن کی طرف اقبال نے اپنی مشہور ومایۂ ناز نظم ''محاورہ مابین خدا اور انسان'' میں اشارہ کیا ہے۔ طوالت کا مطلق خیال نہ کرتے ہوئے آپ کی یادداشت کو تازہ کرنے کے لئے وہ مختصر نظم پیش کروں گا۔

تو شب آفریدی چراغ آفریدم سفال آفریدی ایاغ آفریدم
بیابان وکہسار وراغ آفریدی خیابان وگلزار وباغ آفریدم
من آنم کہ از سنگ آئینہ سازم من آنم کہ از زہر نوشینہ سازم!

اس نظم میں اقبال نے جو باتیں جس طرح جس سطح سے جن مراتب اور مواقف کو ملحوظ رکھ کر کہی ہیں وہ انسان اور شاعر دونوں کے شرف وسعادت کے شایان شان ہیں۔ اس موقع وموضوع پر اگر جدید مکتب فکر اور مسلکِ شاعری کے کسی شاعر کو کچھ کہنا پڑتا تو وہ کس طرح کہتے اور کیا کہتے ظاہر ہے کیا کہتے اس سے معلوم ہوگا کہ اعلیٰ شاعری کے لئے کون سی صلاحیتیں مفید اور مبارک ہوتی ہیں۔

ربط وتسلسل کے اعتبار سے اقبال نے غزل کو نظم سے اور نظم کو غزل سے قریب تر کر دیا اس طرح غزل کے خلاف ایک بڑے الزام کو دور کر دیا کہ اس میں خیالات وجذبات کا انتشار ملتا ہے جو میرے نزدیک اتنا الزام نہیں تھا جتنا غلط فہمی۔ اس سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ غلط فہمیاں

الزام سے زیادہ سخت جان اور صبر آزما ہوتی ہیں۔اس لئے اس منزل سے آسان گزرنا معمولی درجے کے شاعر کی طاقت وتوفیق سے باہر ہوتا ہے اگر کوئی یہ کہے یا محسوس کرے کہ موسیقی کو اردو شاعری سے اور اردو شاعری کو موسیقی سے ہمکنار کرنے اور دونوں کو ہم ردیف بنانے میں اقبال کا بڑا قیمتی حصہ ہے تو اس سے جھگڑنا نہیں چاہیے اس لئے کہ ہمارے بیشتر اردو شعراء نے بالعموم خانقاہوں، مشاعروں اور نشید ونشاط کی محفلوں کے لئے غزل کا انتخاب کیا جو نسبتاً آسان ہوتا اور جلد مقبول عام ہو جاتا۔ اقبال نے زندگی کے سنگین اور صبر آزما حقائق وحوادث کے چیلنج کو قبول کرنے کی دعوت دی اور حوصلہ بخشا اس کے لئے اقبال نے براہ راست نظم اور غزل دونوں سے اس فنکارانہ مہارت شاعرانہ لمس ولطافت اور عارفانہ بصیرت سے کام لیا جو ان کے وسیع اور بے لاگ مطالعے اور غور وفکر کے علاوہ دوسری گوناگوں خداداد صلاحیتوں کا نتیجہ تھیں اس سے اردو شاعری کے وزن ووقعت میں بڑا مفید، مبارک اور مقبول عام اضافہ ہوا۔

غالب نے اردو کو فارسی سے ترکیب دے کر اردو کے حسب ونسب کو بہت اونچا کر دیا لیکن فارسی کو اردو سے اس طرح ممزوج اور ہم آہنگ نہ کر سکے جس طرح مفہوم ومعنیٰ اور صورت اور فضا کے اعتبار سے اقبال نے اپنی فارسی سے کیا، اقبال کی فارسی ایران یا غالب کی فارسی کے مقابلے میں کیسی ہی رہی ہو۔اقبال کا کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے اپنے فارسی یا فارسی رنگ وآہنگ کلام سے فارسی کو ہندوستان میں زیادہ استقلال اور قبول عام بخشا۔

کبھی کبھی ایک آوارہ پرند کی مانند یہ خیال بھی آیا ہے کہ علی گڑھ اور اقبال کو ہم اپنی علمی وتہذیبی زندگی سے حذف کر کے دیکھیں تو ہماری آپ کی شبیہ کیا اور کیسی ہوگی۔شبیہ چاہے جیسی ہو نفسِ مضمون سے میرے بہک جانے کی مثالوں میں سے ایک یہ بھی ہے جسے حسب معمول آپ کو معاف کرنا ہے۔انیس کی مانند اردو کے پلّے کو ''گراں'' اور ''زمین سخت'' کو ''آسمان'' کر دینے میں ہماری نظر بے اختیار اقبال پر بھی پڑتی ہے اور کس اعتماد وافتخار سے پڑتی ہے۔

میں موسیقی کے میزان ومقام سے واقف نہیں ہوں۔اگر پہلے سے سن نہ چکا ہوتا کہ موسیقی سے جانور تک متاثر ہوتے ہیں تو شاید اس کا اقرار کر لیتا کہ موسیقی سے کچھ زیادہ متاثر نہیں ہوتا لیکن اتنا ضرور ہے کہ اکثر اچھے اشعار سن کر ذہن موسیقی کی طرف مائل ہوتا ہے اور اچھی موسیقی سن کر اقبال کے اشعار یاد آنے لگتے ہیں۔شاعری اور موسیقی کا امتزاج حافظ کے ہاں بھی ملتا ہے۔اس فرق کے ساتھ کہ

حافظ تمام تر غزل کے شاعر ہیں، جس میں موسیقی کا عمل دخل آسانی سے ہو جاتا ہے۔

موسیقی کی جو ہم دمی غزل کو حاصل ہے شاید کسی اور صنف سخن کو نہیں ہے حافظ اپنے بیان کے مطابق شکایت مہر و وفا کے شاعر ہیں۔ حافظ اور اقبال نے موسیقی اور شاعری کو باہم دگر کرنے اور رکھنے کے جیسے نغز و نادر نمونے پیش کئے ہیں وہ فارسی اور اردو کے دوسرے شعراء کے یہاں شاید دستیاب نہ ہوں۔ تصوف کے تصرف نے حافظ کو ساز سے قریب اور ستیز سے دور رکھا ہے کہیں کہیں زمانے اور زندگی سے پنجہ آزمائی کی بھی آواز سنائی دے جاتی ہے لیکن یہ آواز رسمی یا روایتی ہے اتنی اقبال کی مانند ''من وگرز ومیداں وافراسیاب'' کی نہیں ہے۔ اقبال اور حافظ دونوں نے قلندری کو اپنایا ہے لیکن اقبال کا قلندر جنگ و جہد کا ہے، حافظ کا خانقاہ کا۔ اقبال کا حرکی ہے، حافظ کا سکونی۔ حافظ کے یہاں ناسازگار حالات کے خلاف برہمی یا بغاوت نہ ملے گی ''چنانچہ نماند چنیں ہم نخواہد ماند'' کا مقام ملے گا، اقبال کے یہاں ''برہم زن'' کی دعوت ہے۔

حافظ کا دور سیاسی شکست وریخت، سماجی ابتری اور عام درماندگی کا تھا۔ بایں ہمہ ان کی شاعری میں زیریں لہر اتنی دل گرفتگی کی نہیں ہے جتنی دل آسائی و دل افروزی کی۔ اقبال کا نعرہ ''یہ گھڑی محشر کی تو عرصہ محشر میں ہے'' تھا قوم اور ملک کو طرح طرح کے آلام و آسائش کا سامنا تھا اس لئے اقبال کی شاعری مجبوری و مایوسی کی نہیں ہو سکتی تھی بڑے اور عالمی شاعر کی ایک پہچان یہ بھی ہے کہ وہ کسی حال میں نہ خود مایوس و ملول ہوگا نہ اپنے سامعین کو ہونے دے گا بڑا شاعر باغی بھی نہیں ہوتا مجاہد ہوتا ہے۔

حافظ اپنے کردار اور شاعری دونوں کے اعتبار سے صوفی تھے۔ اقبال اور غالب کے کلام میں جہاں تہاں تصوف کی آواز سنائی دے جاتی ہے لیکن کردار کے اعتبار سے ان میں کوئی بھی صوفی نہ تھا اس لئے ان کا بیشتر کلام تصوف کے رنگ و آہنگ سے خالی ہے۔ البتہ یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ اقبال کے ہاں تصوف کا روپ اور رنگ ہمیں ملتا ہے جہاں اس کے بغیر راستہ اور رہبری نہیں مل سکتی تھی دانائے راز ہونے کے لئے آشنائے تصوف ہونا ضروری ہے خیال ہے کہ جب تک کوئی شاعر اقبال اور رومی کے پائے کا نہ ہو اس کو تصوف کی وادی میں قدم نہیں رکھنا چاہیے چنانچہ ماورائیت کے مراحل و منازل تصوف کے سہارے کے بغیر طے کرنا تقریباً ناممکن ہے۔

ماورائیت کا لحاظ و احترام ہر بڑی شاعری، مذہب و اخلاق میں کیا گیا ہے خواہ وہ شاعری یا مذہب و اخلاق کسی عہد، قوم اور ملک کا ہو، اردو شاعری میں شعراء کی جیسی کثرت ہے اس کے

حساب سے صوفی شعراء کی تعداد کم اور بہت کم ہے۔ ایسا تو نہیں کہ تصوف شاید اسلام کی روح سے مطابقت نہیں رکھتا۔ اس لئے شعراء اس کی طرف کم مائل ہوئے ہیں یوں بھی کہا جا سکتا ہے کہ تصوف کے تقاضوں کو ہمارے بیشتر شعراء پورا کرنے کا حوصلہ نہ کر سکتے ہوں۔

اقبال اور حافظ دونوں کے کلام میں خدا اور عورت کے بارے میں کوئی ناسزا کلمہ یا اشارہ کنایہ نہ ملے گا بڑے شعر و ادب میں خدا اور عورت کا احترام خاص طور پر ملحوظ رکھا گیا ہے جیسے ان کے ساتھ بیباک ہونا متفقہ طور پر ممنوعات میں قرار دیا گیا ہو۔ اس سے کبھی کبھی اس طرف بھی خیال جاتا ہے کہ کس درجہ کم سواد اور معاشرے کے لئے زہرناک سا شاعر اور فن کار ہوتا ہے جو خدا اور عورت کو اپنے ہفوات کا ہدف بنائے بغیر نہ اپنی شاعری کو شہرت دے سکتا ہے نہ اپنے ساتھیوں سے داد پا سکتا ہے ایسے شاعر اور سامعین بھی کیا کریں جو حفظ مراتب ملحوظ رکھنے کی بڑائی کے احساس سے محروم ہوں، جہاں اعلیٰ اور عظیم کا تصور ہی مختلف یا معدوم ہو وہاں کون کس سے کیا کہے!

اردو شاعری کو ہندوستان ہی نہیں، دوسرے بالخصوص مسلم ممالک کے شعر و ادب کی صف اول میں لا کھڑا کرنا اقبال کا غیر معمول کارنامہ ہے، میرے ذاتی تاثرات تو یہاں تک ہیں کہ اقبال کا ہر کلام غیر معمولی کلام ہوتا ہے اقبال سے پہلے بنگالی کوی مہارشی ٹیگور نے یہ منزلت بخشی لیکن دونوں میں فرق یہ ہے کہ ٹیگور کی شاعری زیادہ تر عبادت، منقبت اور معرفت کی شاعری سے ہے جس میں ماورائیت کو زیادہ دخل ہے ان کے ہاں ارضی اور ہمہ وقت بدلنے والے عالمی مسائل و مشکلات کی نشاندہی اور ان سے مقابلہ کرنے کی تلقین نہیں ملتی۔ یہ ذکر مسلک، روایات اور جینیس سے متعلق ہے جن سے ٹیگور مستفید اور تمام عمر نغمہ سرا رہے۔

دراصل کہنے یہ جا رہا تھا کہ اقبال نے نعت گوئی کو میلاد ناموں اور میلاد خوانوں کی گرفت سے نکال کر کلاسیکی دے دینا معمولی بات نہیں ہے اور کتنی عجیب بات یہ ہے کہ اسلامی ممالک کے شعراء نے اس صنف کو کیوں کر نظر انداز کر دیا۔ ایران اور عرب سے قطع نظر غالباً دوسرے ممالک میں شعر و ادب سے بے گانگی کا یہ نتیجہ ہے۔ کیسے کہا جائے کہ بیشتر مسلم ممالک اقبال کے اس قول سے کہ ''گر بمصطفیٰ نہ رسی تمام بولہبی است'' سے ناواقف تھے۔

عشقِ رسول اقبال کے کلام و پیام اور خود ان کے وجود شعری کی روح ہے، عربی فارسی اور اردو شاعری میں جتنے قابل لحاظ شعراء گزرے ہیں کم و بیش سب نے اپنی اپنی بساط کے مطابق بارگاہ

رسالتؐ میں عقیدت وارادت کے نذرانے پیش کئے ہیں ۔نعت ہمارے شعروادب کی قابل قدر روایت بن گئی ہے ایسی روایت جو شاعری میں عبادت کے عناصر وعوامل کے ساز وبرگ کا سامان بہم پہنچاتی ہے نعت کو شاید کسی اور مذہب وملت میں وہ اہمیت حاصل نہ ہو جو ہمارے شعروادب میں ہے۔ نعت قدیم کو نعت جدید سے قریب لانے اس کو مقصد دینے، متحرک کرنے اور رکھنے کی ابتداء حالؔی نے کی جسے اقبال نے اس درجے تک پہنچادیا جس سے آگے پہنچانا اب کسی دوسرے ہی اقبال کا کارنامہ ہوگا اور مستقبل بعید تک کسی دوسرے اقبال کا ظہور پانا آسان نہیں معلوم ہوتا۔

اس صدی میں اب تک ہم جن آزمائشوں سے گزرے ہیں اور شاید گزرتے رہیں ان سے عہدہ برآ ہونے کے لئے اقبال کے کلام سے جو تقویت اور تسکین ملتی رہتی ہے وہ اس صدی کے کسی اور شاعر اور اسکی شاعری میں نہیں ملتی ۔ یہ کیوں اور کیوں کر؟ اس کا نہایت مختصر لیکن کعبہ آثار اور عرفات اساس جواب عشقِ رسول ہے جس سے ہماری روح روشن اور ''حوصلے زیاد'' رہتے ہیں خواہ ہم کہیں اور کسی حال میں ہوں ۔اقبال نے ہمارے لئے سرور دوعالم کی عظیم جلیل اور رحمتِ عالم ہونے کی بازیافت کی ہے جو شاعر اس کی شاعری اور ہمارے شعائر کو ہمیشہ انفرادی، اجتماعی اور سماجی امتیاز سے برگزیدہ بلند ومفتخر رکھے گی ایسی بروقت بازیافت ہماری تاریخ میں مجھے تو اب تک نظر نہ آئی۔

عزیزو! آپ نوجوانوں کی رفعت ورفاہ کے لئے اقبال کے کرب اور کراہ کی آواز جا بجا ان کے کلام میں سنائی دے جاتی ہے مثلاً جہاں انہوں نے ہم کو آپ کو ''سید پاک کی اولاد'' کہہ کر پکارا ہے اور اپنی نشاندہی'' آباً مرے لاتی ومناتی'' سے کی ہے ایسا محسوس ہونے لگتا ہے جیسے اپنی روح کی گہرائیوں سے ہم کو آپ کو یاد دلا رہے ہوں یا واسطہ دلا رہے ہوں کہ مجھے دیکھو کہ لاتی ومناتی ہونے کے باوجود آپ کو سید پاک ہونے کی ذمہ داری اور شرف کی یاد دلاتا ہوں اور گڑگڑاتا ہوں کہ آپ نے توجہ نہ کی تو آپ تمام دنیا کے لاتیوں اور مناتیوں کو کس طرح منہ دکھائیں گے۔ سید پاک کی اولاد کو اپنی لاتی ومناتی ہونے کی تصویر دکھا کر اقبال نے یہاں تاثیر کا جو اعجاز دکھایا ہے اس کی مثال کہیں کم ملے گی۔نشیب کی بلندی'' آباً میرے لاتی ومناتی'' اور فراز کی پستی تو سید پاک کی ہے اولاد کو اقبال نے جس عقیدت اور بلاغت سے واضح کیا ہے وہ انہی کے بس کی بات تھی۔

☆☆☆

امتیاز علی خان عرشی

اقبال اور آرزوئے نایافت

مولانا جلال الدین رومی کا ایک قطعہ ہے

دی ، شیخ باچراغ ہمی گشت گرد شہر
کز دام ودد ملولم وانسانم آرزوست
زیں ہمرہانِ سُست عناصر دلم گرفت
شیر خدا و رستم دستانم آرزو ست
گفتم کہ یافت می نشود ، جستہ ایم ما
گفت ''آں کہ یافت می نشود آنم آرزوست''

علامہ اقبال بھی رومی کے اس ''نایاب انسان'' کے آرزومند ہیں لیکن کوشش وجستجو کے باوجود ان دونوں بزرگوں کو کم ازکم اقبال کو اپنی آرزو کی تکمیل کا موقع نہ ملا اس ناکامی کے اسباب دو جوہ کیا تھے اس امر کی تہہ تک پہنچنے کے لئے ان خصوص اور صفتوں پر نظر کرنا چاہیے جو اقبال کے خیال میں اس ''یافت می نشود'' میں پائی جاتی ہیں۔ ورنہ اس عالم آب وگل میں انسانوں کا قحط نہ پہلے تھا نہ اب ہے۔

اقبال کا انسان حسن وقبح اشیائیں عقل وخرد سے کام لینے پر آمادہ ہوگیا تو فطرت الہیٰ نے اسے کائنات کی خلافت سپرد کر کے جنت کے ''میخانہ بے خروش'' سے دنیا کے ''گہوارۂ جذب ومستی'' میں حاکمانہ داخلے کی اجازت عطا فرمائی۔ فرشتوں نے اسے ان الفاظ کے ساتھ خدا حافظ کہا

عطا ہوئی ہے تجھے روز وشب کی بیتابی خبر نہیں کہ تو خاکی ہے یا کہ سیمابی
سنا ہے خاک سے تیری نمود ہے لیکن تری سرشت میں ہے کوکبی و مہتابی
گراں بہا ہے ترا گریۂ سحر کاری اسی سے ہے ترے نخل کہن کی شادابی

تری نوا سے ہے بے پردہ زندگی کا ضمیر کہ تیرے ساز کی فطرت نے کی ہے مضرابی

انسان نے اس زمین کدوکاوش پر قدم رکھا تو روح ارضی نے استقبال کرتے ہوئے عرض کیا

کھول آنکھ زمیں دیکھ ، فلک دیکھ ، فضا دیکھ
مشرق سے ابھرتے ہوئے سورج کو ذرا دیکھ
اس جلوۂ بے پردہ کو پردوں میں چھپا دیکھے
ایام جدائی کے ستم دیکھ ، جفا دیکھ
بے تاب نہ ہو ، معرکۂ بیم ورجا دیکھ

ہیں تیرے تصرف میں یہ بادل ، یہ گھٹائیں
یہ گنبد افلاک ، یہ خاموش فضائیں
یہ کوہ یہ صحرا ، یہ سمندر ، یہ ہوائیں
تھیں پیشِ نظر کل تو فرشتوں کی ادائیں
آئینہ ایام میں آج اپنی ادا دیکھ

سمجھے گا زمانہ تری آنکھوں کے اشارے
دیکھیں گے تجھے دور سے گردوں کے ستارے
ناپید ترے بحر تخیل کے کنارے
پہنچیں گے فلک تک تری آہوں کے شرارے
تعمیر خودی کر اثرِ آہِ رسا دیکھ

خورشید جہاں تاب کی ضو تیرے شرر میں
آباد ہے اک تازہ جہاں تیرے ہنر میں
جچتے نہیں بخشے ہوئے فردوس نظر میں
جنت تری پنہاں ہے ترے خون جگر میں
اے پیکرِ گل کوشش پیہم کی جزا دیکھ

نالندہ ترے عود کا ہر تار ازل سے
تو جنس محبت کا خریدار ازل سے
تو پیر صنم خانۂ اسرار ازل سے
محنت کش وخوں ریز و کم آزار ازل سے
ہے راکب تقدیر جہاں تیری رضا دیکھ

روحِ ارضی نے اپنے استقبالیے میں انسان کی ان امتیازی صفات کا تذکرہ کیا ہے کہ وہ اسرار کائنات کا کھوج نکالنے میں بیم درجا کا معرکہ سر کرلے گا، آئینہ ایام میں اپنی ادائیں دیکھ کر خودی کی تعمیر کرے گا اپنے خون جگر سے نئی دنیا اور انوکھی جنت بسائے گا اور تقدیر جہاں کو اپنے قبضے میں رکھے گا۔

بالفاظ دیگر جس انسان کی اقبال کو تلاش ہے اس میں حقائق کی تلاش کا جذبہ ہونا چاہیے ایسا شدید جذبہ کہ کوئی خوب اور کسی طرح کا لالچ اس کا راستہ روک کر نہ کھڑا ہو سکے اس دنیا میں اپنا حقیقی مقام اور واقعی منصب متعین کر کے اس منصب اور فریضے کی تعمیل میں ہر طرح کی قربانی پیش کرنے کے لئے وہ بیتاب و مضطرب رہے ایسا مضطرب کہ اس اضطراب کے فعلیت میں تبدیل ہو جانے پر خالق و مخلوق کی تقدیر اور رضا ایک ہو جائے۔ یا کم از کم ان کو دو کہنا ناممکن نظر آنے لگے

اس سے بھی زیادہ مختصر لفظوں میں مطلب ادا کیا جائے تو کہا جا سکتا ہے کہ اقبال کے انسان میں مجنونانہ جرأت و ہمت اور عاشقانہ شیفتگی کے ساتھ اپنا اور اپنے فرض منصبی کا سچا علم اور اس علم پر قرار واقعی عمل ہونا لازمی ہے۔

انسان کی اس خصوصیت کو اقبال نے کبھی عشق، جنون اور قلندریت سے اور کبھی خودی یا ایمان سے تعبیر کیا ہے اور اس صفت کے حامل کو ہمیشہ قلندر، فقیر یا مومن کہہ کر پکارا ہے۔ ان کے مومن، عاشق، فقیر اور قلندر کی صفات مشترکہ اتنے زیادہ اور ممیّزہ اتنے کم ہیں کہ انہیں ایک نہ ماننا ایک طرح کی ناانصافی کے مترادف ہے میں یہاں فرداً فرداً ہر ایک کی صفات پیش کرتا ہوں۔

عشق

پہلے عشق و عاشقی کے متعلق اقبال کے ارشادات سنیے

بیا اے عشق ، اے رمز دل ما
بیا ، اے کشتِ ما اے حاصل ما
کہن گشتند ایں خاکی نہاداں
دگر آدم ہنا کن از گلِ ما

اس مقدس اور پاک جذبہ کو نہ ہر شخص جانتا ہے اور نہ ہر ہستی اس کے لائق ہے۔

ہر کسے از رمزِ عشق آگاہ نیست
ہر کسے شایانِ ایں درگاہ نیست
داندآں کو نیک بخت ومحرم است
زیر کی زابلیس وعشق از آدم است

یہی وجہ ہے کہ پست ہمت، کمینہ طبیعت اور بد باطن کو یہ نعمت عطا نہیں ہوتی۔

ندارد کار بادوں ہمتاں عشق
تدروِ مردہ راشاہین نگیرد
نگاہ عشق دلِ زندہ کی تلاش میں ہے
شکار مردہ سزاوار شاہ باز نہیں

انسان کی کامیابی، کامرانی، سربلندی اور اس کے تمام اعمال کی قوتِ محرکہ عشق ہے۔ عقل وخرد اور علم وحکمت اس کے بغیر مردہ، زہر ہلاہل اور سراسر گمراہی ہیں۔

عقل و دل ونگاہ کا مرشد اولین ہے عشق
عشق نہ ہوتو شرع ودین بتکدۂ تصورات
صدقِ خلیل بھی ہے عشق، صبر حسین بھی ہے عشق
معرکۂ وجود میں بدروحنین بھی ہے عشق
تازہ مرے ضمیر میں معرکۂ کہن ہوا
عشق تمام مصطفیٰ، عقل تمام بولہب
یہ جوہر اگر کا رفرما نہیں ہے
تو ہیں علم وحکمت فقط شیشہ بازی

عشق اس ناپیدا کنار کائنات پر محیط اور اس کے اقدار زمانی ومکانی کا حاکم ہے اس کی گرفت ورسائی سے دنیا کا کوئی گوشہ باہر نہیں۔

مرد خدا کا عمل عشق سے صاحب فروغ
عشق ہے اصلِ حیات ، موت ہے اس پر حرام
تند وسبک سیر ہے گرچہ زمانے کی رو
عشق خود اک سیل ہے سیل کو لیتا ہے تھام
عشق کی تقویم میں عصرِرواں کے سوا
اور زمانے بھی ہیں ، جن کا نہیں کوئی نام
عشق کی ایک جست نے طے کردیا قصہ تمام
اس زمین وآسماں کو بیکراں سمجھا تھا میں

یہی نہیں عشق وجنوں یزداں شکار بھی ہیں:

دردشتِ جنون جبریل زبوں صیدے
یزداں بکمند آور ، اے ہمت مردانہ

حکمت وفلسفہ بحث ونظر کے ہزاروں دروازے کھول سکتے ہیں، مگر عمل کا ایک قدم بھی نہیں اٹھا سکتے یہ عشق ہی ہے جو جرأت وہمت کے معجزانہ کام انجام دے سکتا ہے

بے خطر کود پڑا آتش نمرود میں عشق
عقل ہے محو تماشائے لب بام ابھی
صحبت پیر روم سے مجھ پہ ہوا یہ راز فاش
لاکھ حکیم سربجیب ایک کلیم سربکف

ایمان ویقین

عشق کی اس ثناوصفت کے بعد جو اقبال کے کلام کے چند بکھرے موتی کہے جاسکتے ہیں۔ ایمان ویقین کی تعریف ملاحظہ کیجئے۔

یقین مثل خلیل آتش نشینی
یقیں اللہ مستی ، خود گزینی

سن اے تہذیب حاضر کے گرفتار
غلامی سے ہے بدتر بے یقینی

ایمان ویقین تقدیرِ عالم کو بدل سکتے ہیں

کوئی اندازہ کرسکتا ہے اس کے زور بازو کا
نگاہ مرد مومن سے بدل جاتی ہیں تقدیریں

یقین وایمان سے جو بلند ہمت اور بے پناہ قوت پیدا ہوتی ہے اس کی اثر آفرینی کا اندازہ اس سے کیا جاسکتا ہے۔

ہاتھ ہے اللہ کا بندۂ مومن کا ہاتھ
غالب وکار آفریں ،کارکشا ، کارساز
نقطۂ پرکار حق ، مرد خدا کا یقیں
اور یہ عالم تمام وہم وطلسم ومجاز

فقر

فقر کی توصیف اقبال نے ان الفاظ میں کی ہے

فقر کے ہیں معجزات ، تاج وسریر وکلاہ
فقر ہے میروں کا میر ، فقر ہے شاہوں کا شاہ
علم کا مقصود ہے پاکی علم وخرد
فقر کا مقصود ہے عفت قلب ونگاہ
علم فقیہ وحکیم ، فقر مسیح وکلیم
علم ہے جویائے راہ ، فقر ہے دانائے راہ
فقر مقامِ نظر ، علم مقام خبر
فقیر میں مستی ثواب ، علم میں مستی گناہ
چڑھتی ہے جب فقر کی سان پہ تیغ خودی
ایک سپاہ کی ضرب کرتی ہے کار سپاہ

فقر انسانیت کا معمار ہے، قلب ماہیت کرنا اس کا کام ہے سطح چمکا دینا نہیں یہ دولت وحکومت کی کارستانیاں ہیں

مرا فقر بہتر ہے اسکندری سے
یہ آدم گری ہے وہ آئینہ سازی

قلندر

اقبال نے قلندر کی پہچان بھی بتائی ہے فرماتے ہیں

کہتا ہے زمانے سے یہ درویش جواں مرد
جاتا ہے جدھر بندہ حق تو بھی ادھر جا
ہنگامے ہیں میرے تری طاقت سے زیادہ
بچتا ہوا نگاہ قلندر سے گزر جا
میں کشتی وملاح کا محتاج نہ ہوں گا
چڑھتا ہوا دریا ہے اگر تُو ،تو اُتر جا
توڑا نہیں جادو مری تکبیر نے تیرا؟
ہے تجھ میں مگر جانے کی جرأت تو مگر جا
مہرومہ وانجم کا محاسب ہے قلندر
ایام کا مرکب نہیں ، راکب ہے قلندر

قلندر کی بارگاہ کا شان وشکوہ شاہوں سے بالاتر ہے

نہ تخت وتاج میں نے لشکر وسپاہ میں ہے
جو بات مرد قلندر کی بارگاہ میں ہے

صفات مومن

اقبال اس پاکباز بندے کی اخلاقی کیفیات کی طرف بھی اشارہ کرتے ہیں

جس سے جگر لالہ میں ٹھنڈک ہو ، وہ شبنم
دریاؤں کے دل جس سے دہل جائیں وہ طوفاں

ہو حلقۂ یاراں تو بریشم کی طرح نرم
رزمِ حق و باطل ہو تو فولاد ہے مومن

.....

پرسوز و نظر باز و نکوبین و کم آزار
آزاد و گرفتار و تہی کیسہ و خورسند
اگر ہو جنگ ، تو شیرانِ غاب سے بڑھ کر
اگر ہو صلح تو رعنا غزالِ تاتاری

.....

خاکی و نوری نہاد ، بندۂ مولا صفات
ہر دو جہاں سے غنی ، اس کا دل بے نیاز
اس کی امیدیں قلیل اس کے مقاصد جلیل
اس کی ادا دل فریب ، اسی کی نگہ دلنواز
نرم دم گفتگو ، گرم دم جستجو
رزم ہو یا بزم ہو ، پاک دل و پاک باز

ظاہر ہے کہ مذکورۂ بالا صفات جس شخص کے اندر جمع ہوں گے وہ زمین کا وارث برحق تسلیم ہو کر رہے گا اقبال نے اس کی وراثت پر استدلال بھی قائم کیا ہے۔

جہاں تمام ہے میراث مرد مومن کی
مرے کلام پہ حجت ہے نکتۂ لولاک

مگر میرے خیال میں حجت و دلیل سے یہ مسئلہ بلند ہے کائنات خود اس کی خودی کو دعوت دے گی کہ

چو موج مست خودی باش و سر بہ طوفاں کش
ترا کہ گفت بنشیں دپابداماں کش

بہ قصد صید پلنگ از چمن سرابر خیز
بہ کوہ رخت کشا ، خیمہ در بیاباں کش
بہ مہر وماہ کمندِ گلو فشار انداز
ستارہ رازِ فلک گیر ودر گریباں کش

بہر حال مجھے یہاں کہنا یہ ہے کہ اقبال اور رومی نے ان صفات کے انسان کی آرزو کر کے خاکدان بے کیف میں اس کا سراغ نہ پایا تو یہ انسان کی پستی سے زیادہ ان کے مطمح نظر کی بلندی کا نتیجہ تھا، ۔کیا ہر انسان یہ کہہ سکتا ہے

متاعِ بے بہا ہے درد وسوزِ آرزو مندی
مقامِ بندگی دے کر نہ لوں شان خدا وندی

اس کے لئے وقت درکار ہے اتنا طویل جس کی تجدید خود اس عالم نو کے پہلے مرد مومن نے بھی مناسب نہ جانی بہر حال نا امیدی مومن کی شان سے بعید ہے ہمیں یہ یقین رکھنا چاہیے کہ

ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں
ابھی عشق کے امتحاں اور بھی ہیں
تہی زندگی سے نہیں یہ فضائیں
یہاں سینکڑوں کارواں اور بھی ہیں
اگر کھوگیا اک نشیمن تو کیا غم
مقاماتِ آہ وفغاں اور بھی ہیں

اگر ہم نے کوشش کر کے اقبال کے نصب العین کی کسی حد تک پیروی کر لی تو اس دنیا میں اپنی ،اپنے ملک کی اور اپنے ہمسایوں کی دوبارہ سربلندی حاصل کر لینے میں شک وشبہ کی گنجائش باقی نہ رہے گی۔

☆☆☆

منظر حسین
شعبۂ اُردو، رانچی یونیورسٹی، رانچی

ٹیگور اور اقبال

(مشابہت وافتراق کے چند اہم پہلو)

بیسویں صدی میں ہندوستان کی جن دو عبقری شخصیتوں نے اپنی فکری بلوغت، مثبت اور تعمیری انداز فکر، غیر معمولی فنی بصیرت اور انسان دوستی کے شدید جذبوں کی لازوال برکتوں سے پورے عالم انسانیت کو متاثر کیا ہے وہ ہیں گرو دیو ربندر ناتھ ٹیگور اور شاعر مشرق علامہ اقبال۔ ان دونوں عظیم فنکاروں کا عہد تقریباً ایک تھا لیکن دونوں دو مختلف تہذیبی اقدار، ذاتی عقائد، ادبی رویہ، انفرادی تشخص اور میلانات کے اعتبار سے مختلف ہوتے ہوئے بھی ان میں فکری وذہنی اعتبار سے مشابہت وقربت کے پہلو بھی نمایاں ہے۔ ٹیگور نے گیتا کے فلسفے کو بنیاد بنا کر کرم یوگی کا تصور پیش کیا اور جہد مسلسل کی تبلیغ کو اپنی زندگی کا مشن بنایا تو دوسری طرف اقبال کی شعری فطانت نے اسلامی اقدارِ زندگی اور اسلامی تصوف کے مضمرات کو اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے یقین محکم، عمل پیہم اور نگاپوئے دمادم کا تصور پیش کیا اور انسان کے مقام کو سربلند کرنے کی کوشش کی۔ یہ بھی تاریخ کا المیہ ہے کہ ان دو عظیم شخصیتوں کی روبرو کوئی ملاقات نہ ہوسکی۔ اس کے باوجود دونوں ایک دوسرے کے تئیں عقیدت واحترام کا جذبہ رکھتے تھے۔ ٹیگور نے اپنے ایک خط بنام عباس علی خان لمحہ حیدرآبادی بابت 7 فروری 1933ء میں اقبال کے متعلق اپنے جذبات کا اظہار کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ہم دونوں ایک دوسرے کے دوست ہیں اور زندگی کے حسن اور حقائق کو اپنے اپنے طور پر پیش کر رہے ہیں اور یہ کہ انہیں ایک دوسرے کا اچھا دوست سمجھا جائے۔ ٹیگور نے اپنے اس احساس کا عملی ثبوت بھی پیش کیا۔ ٹیگور.... میں جب لاہور کا سفر کیا تو اقبال سے ملاقات کے لئے ان کے گھر بھی تشریف لے گئے لیکن اقبال کے لاہور میں نہ رہنے کی وجہ کر ملاقات نہ ہوسکی تھی۔ اس کا سراغ ہمیں اقبال کے ایک خط بنام عباس علی خان لمحہ حیدرآبادی بابت

۱۱ مارچ ۱۹۳۴ سے ملتا ہے۔ اقبالؔ لکھتے ہیں:۔

''.....آپ کے ایماء پر ٹیگور میری مزاج پرسی کے لئے لاہور آئے تھے۔ مگر میں لاہور میں موجود نہ تھا۔ اس لئے ملاقات نہ ہوسکی۔ آپ انہیں مطلع کردیں.....''

اقبال ٹیگور کے کارناموں کے کس قدر معترف تھے اس کا پتہ ہمیں ان کی اس گفتگو سے بھی ہوتا ہے جو انہوں نے اپنے دوست سید امجد علی سے کرتے ہوئے جہاز پر اس وقت کہا تھا جب وہ 1932 میں تیسری گول میز کانفرنس میں شرکت کے لئے تشریف لے جارہے تھے۔ ٹیگور سے اپنا موازنہ کرتے ہوئے کہا تھا:۔

''ٹیگور اور میرے درمیان صرف اتنا فرق ہے کہ وہ آرام اور سکون کی تبلیغ کرتے ہیں لیکن عملی طور پر کام کرتے ہیں لیکن میں عمل کی بات کرتا ہوں لیکن خود تساہل برتتا ہوں۔''

(بحوالہ اقبال شاعر اور سیاست داں از ڈاکٹر رفیق ذکریا، صفحہ ۴۳)

ٹیگور اور اقبالؔ کے تقابلی مطالعے میں یہ پہلو بھی کافی اہمیت کا حامل ہے کہ دونوں سچے محب وطن تھے اور دونوں کو اپنی دھرتی سے اٹوٹ محبت تھی۔ دونوں کو تعمیر وطن کی فکر تھی۔ لہذا وہ اتحاد باہمی، محبت اور قوم پرستی کی بنیادوں پر ایک نئے ہندوستان کی تعمیر کا خواب دیکھ رہے تھے۔ دونوں کے یہاں وطن اور اس کے ہر ذرے سے محبت، خلوص اور ایثار کا جذبہ نظر آتا ہے۔ دونوں مناظر فطرت اور مظاہر قدرت کے دلدادہ اور شیدائی ہیں اور دونوں اپنی دھرتی میں فطرت کے اس حسن کے متلاشی نظر آتے ہیں جو مادر وطن سے ان کی جذباتی وابستگی اور عقیدت کا بین ثبوت فراہم کرتی ہے۔ اپنی باتوں کو تقویت بخشنے کے لئے دونوں عظیم شعراء کی ایک ایک نظم سے چند منتخب اشعار پر اکتفا کرتا ہوں۔ ٹیگور کی ایک نظم ''وسن دھرا'' کے یہ اشعار دیکھئے۔

میری پرتھوی ہو تم
جگوں جگوں کی، تم نے اپنی گود میں
مجھے لے کر بیکراں آکاش میں

نہ تھکنے والے پیروں سے طواف کیا ہے
نظام شمسی کی ان گنت راتوں اور دنوں
اور قرنوں قرنوں تک، تم نے مجھے اپنی مٹی میں جذب کرلیا ہے
میرے بیچ اُگی ہے تمہاری گھاس، بوجھ کے بوجھ پھول
کھلے ہیں قطار در قطار، درختوں نے
پتوں پھولوں پھلوں اور خوشبوؤں کو برسایا
اسی لئے آج پدماندی کے کنارے ایک عجیب کیفیت میں اکیلا بیٹھا ہوا
پر اشتیاق آنکھیں پھیلا کر
اپنے سارے جسم میں سارے دل میں تمہارا وجود محسوس کرتا ہوں

(بحوالہ ایک سو ایک نظمی، ترجمہ فراق گورکھپوری)

اندازہ لگایا جاسکتا ہے تمام اشعار میں دھرتی سے اٹوٹ محبت اور جب الوطنی کا جذبہ سمندر کی موجوں کی طرف ٹھاٹھیں مار رہا ہے جو مناظر فطرت کی بوقلمونی سے مزین ہے جس یں پاکبازی بھی ہے اور طہارت بھی، شاعر کے جذبات واحساسات قدرت کی صناعی کی ثناخوانی کے امین ہیں جو فنکار کے تخیل اور وجدان کا حصہ بن کر تخلیقات میں مدغم ہوگئے ہیں۔ اس قسم کی مثالیں ٹیگور کی دوسری نظموں مثلاً خواب آبشار، پراتھنا، بھارت تیرتھ، بولا کا، میرا سنہرا بنگال، مجھے تم سے محبت ہے، اے میرے ملک کی مٹی تجھے میرا سلام وغیرہ سے بھی پیش کی جاسکتی ہیں۔ اس سلسلے میں ان کی نظم ''امرتو'' کہ یہ اشعار میرے خیالات کی تائید کریں گے۔

کیوں کہ میرا گھر تو خود ہی وہیں ہے
جس زمین پر گھاس اگتی رہتی ہے
جس کے اوپر سے منتر پڑھتی ہوئی دھن کی ہوا
گزرتی رہتی ہے
ان نیلے آسمانوں کے نیچے جن پر سرمدی چراغ
جلتے رہتے ہیں

میں اسی رقاصہ عالم کے پیچھے خود ورقص کرتا ہوا
پاگل کی طرح چلتا رہتا ہوں
جو راگینی بوکول پھول کی شاخوں میں ترتیب کے
ساتھ پھول کھلاتی ہے
جس نے بے کار اڑتے رہنے کا شوق چیل کے
پروں میں باندھ دیا ہے
اسی نے میرے خون میں موجوں کا تلاطم بخشا ہے
وہی خوابوں کی دنیا میں سروں کا پنکھ پسارے اڑتا
رہتا ہے۔

جہاں تک اقبالؔ کی حب الوطنی کا معاملہ ہے یہ بات بلاخوف تردید کہی جاسکتی ہے کہ اقبال کی شدتِ احساس نے جب شعر کے پیکر میں ملبوس ہونا چاہا تو سب سے پہلے جو نظم معرض وجود میں آئی وہ ''ہمالہ'' ہے جس کی کوکھ سے ہندوستان کی سب سے پوتر ندی گنگا نے جنم لیا۔ اس نظم میں منظر نگاری اور پیکر تراشی دونوں ایک دوسرے سے ہم آہنگ ہوگئے ہیں جو فنکار کی فنی بصیرت پر دال ہیں۔ ہمالہ صرف ایک پہاڑ ہی نہیں بلکہ ہندوستان کی قدیم تہذیب کی یادگار بھی ہے۔ یہ ملک کے تحفظ اور اس کی سالمیت کی علامت بھی۔ ساتھ ہی اس کا مقام طور سینا سے بھی بڑھ کر ہے۔

ایک جلوہ تھا کلیم طور سینا کے لئے
تو تجلی ہے سراپا چشم بینا کے لئے

چونکہ ہمالہ کی عظمت کا راز ملک کی قدیم تاریخ کی قدروں سے بھی وابستہ ہے لہذا وہ اس کے بھی آرزومند ہیں۔

اے ہمالہ داستان اس وقت کی کوئی سنا
مسکن آبائے انسان جب بنا دامن تیرا
کچھ بتا اس سیدھی سادی زندگی کا ماجرا

داغ جس پہ غازہ رنگ تکلف کا نہ تھا
ہاں دکھادے اے تصور پھر وہ صبح وشام تو
دوڑ پیچھے کی طرف اے گردش ایام تو

اقبال کی دوسری نظمیں جن میں حب الوطنی کا تابناک اظہار ہے ان میں نیا شوالہ کا یہ مصرع ''خاک وطن کا مجھ کو ہر ذرہ دیوتا ہے''۔ آفاقیت کا درجہ حاصل کر چکا ہے جس میں شاعر اہل وطن کو یہ پیغام دینا چاہتا ہے کہ وطن کی سلیت اور قومی اتحاد کے لئے ضروری ہے کہ مختلف مذاہب کے پیروکار ایک دوسرے کے تئیں عزت واحترام کے جذبے کو فروغ دیں اور محبت واخوت کی فضا قائم رکھیں۔

شکتی بھی شانتی بھی بھگتوں کے گیت میں ہے
دھرتی کے واسیوں کی مکتی پریت میں ہے

اسی طرح کی دوسری نظموں مثلاً تصویر درد، ہندوستانی بچوں کا قومی گیت، ترانہ ہندی میں حب الوطنی کا پر جوش اور ولولہ انگیز جذبہ اجاگر ہوتا ہے۔ اس سلسلے میں بانگ درا کی ایک نظم ''شعاع امید'' کا ذکر غیر مناسب نہ ہوگا۔ اس نظم میں جذبہ حب الوطنی اپنی انتہائی بلندیوں پر ہے نظم کے تیسرے بند میں ہندوستان کی عظمت اور اس کی شاندار تاریخ کو جس والہانہ دلچسپی اور شیفتگی کے ساتھ پیش کیا گیا ہے اس کی روشنی میں اس نظم کو حب الوطنی کا دستاویز کہہ سکتے ہیں۔ شوخ کرن کا یہ Will Power کہ وہ ہند کی تیرہ وتاریک فضا کو اس وقت تک اپنی پرواز کی جولانگاہ بنائے رکھے گی، جب تک مردان گراں خواب غفلت سے بیدار نہ ہو جائیں۔

چھوڑوں گی نہ میں ہند کی تاریخ فضا کو
جب تک نہ اٹھیں خواب سے مردان گراں خواب

کسی بڑے فنکار کی عظمت کی ایک شناخت یہ بھی ہے کہ اس کے سرمایہ فکر میں اپنے وطن کی عظیم شخصیتوں اور کارناموں کے پیش کرنے میں کس حد تک وسعت قلبی کا مظاہرہ کیا ہے۔ اس جہت سے بھی دونوں عظیم فنکاروں ٹیگور اور اقبال کے کلام کا مطالعہ کافی اہمیت کا حامل ہے۔ ان دونوں فنکاروں نے اپنی شعری تخلیق کو ان عظیم ہستیوں کی یاد سے آباد کیا ہے جنہوں نے تاریخِ

دھارے کو متعین کرنے میں کلیدی رول ادا کئے ہیں۔ ٹیگور نے اپنی شاعری کو ہندوستان کی جن عظیم شخصیتوں سے مزین کیا ہے۔ ان میں کالی داس، گرو گووند، شاہجہاں، گاندھاری وغیرہ کے علاوہ کئی نام اور ہیں جن کے تئیں ٹیگور کا برتاؤ ان کی کشادہ قلبی، وسیع المشربی، انسانی اخوت اور مذہبی رواداری کا پتہ دیتا ہے۔ ٹیگور نے ان شخصیتوں کے کارناموں کا نہ صرف ریکارڈ پیش کیا ہے بلکہ انکے پیغامات سے اپنی شعری دنیا کو آباد کیا ہے۔ اپنی نظم میگھ دوت میں کالی داس کو شاعر اعظم سے مخاطب کیا تو دوسری طرف نظم ''شاہجہاں'' میں تاج محل کو محبت کا پیغامبر گردانتے ہوئے اسے نیا میگھ دوت سے موسوم کیا ہے۔ شاعر کی شاہجہاں سے مخاطبت کا انداز دیکھئے۔

اے شہنشاہ شاعر
یہی تمہارے دل کی تصویر ہے
یہی تمہارا نیا میگھ دوت ہے
بے مثال، لاثانی
چھندوں اور گیتوں میں ابھرا ہے عالم غیب کی طرف.....

اقبالؔ نے ہندوستان کی جن عظیم شخصیتوں کو اپنی شاعری میں جگہ دی ہے ان میں گوتم بدھ، گرونانک جسے بانیان مذہب بھی ہیں تو دوسری طرف رام، وشوامتر، سوامی رام تیرتھ، بھرتری ہری، معین الدین چشتی، محبوب الٰہی حضرت نظام الدین اولیاء، مجدد الف ثانی جیسے مذہبی وروحانی پیشوا بھی، ٹیپو سلطان، اور شیر شاہ جیسے شاہان مملکت سے عقیدت کا اظہار ہے تو دوسری طرف سرسید احمد خان جیسے مصلح قوم کے اصلاحی کارناموں کا اعتراف بھی۔ جاوید نامہ میں شاعر مشرق نے گوتم بدھ کے فلسفہ اخلاق کی تشریح وتوضیح کی ہے تو بانگ درا میں شری رام چندر کو ہندوستان کا امام تسلیم کیا ہے۔

ہے رام کے وجود پہ ہندوستاں کو ناز
اہل نظر سمجھتے ہیں اس کو امام ہند
اعجاز اس چراغ ہدایت کا ہے یہی
روشن تراز سحر ہے زمانے میں شام ہند

تلوار کا دھنی تھا شجاعت میں فرد تھا
پاکیزگی میں جوش محبت میں فرد تھا

اقبال نے ہندوستان کی جن دیگر عظیم شخصیتوں کو خراج عقیدت پیش کیا ہے ان میں گرونانک کو بھی نمایاں مقام ہے۔ اپنی نظم ''نانک'' میں اقبال نے انہیں مرد کامل اور توحید کا سب سے بڑا علمبردار قرار دیا ہے۔ دیکھئے یہ شعر۔

پھر اٹھی آخر صدا توحید کی پنجاب سے
ہند کو ایک مرد کامل نے جگایا خواب سے

ہندوستان کے ایک ویراگی شاعر اور فلسفی بھرتری ہری اقبال کے محبوب ہندو شعراء میں ہیں۔ شاعر مشرق اس قدر متاثر ہیں کہ بھرتری ہری کے ایک اشلوک کو فارسی کا شعری جامہ عطا کر کے 'بال جبریل' کا عنوان بنا دیا۔

پھول کی پتی سے کٹ سکتا ہے ہیرے کا جگر
مرد ناداں پہ کلام نرم نازک بے اثر

جاوید نامہ کے ''آں سوئے افلاک'' والے حصہ میں زندہ رود کی ملاقات بھرتری ہری سے ہوتی ہے۔ رومی شاعر کو اس سے استفادہ کرنے کی تلقین کرتے ہیں۔ لہذا موقع کو غنیمت جان کر زندہ رود پوچھتا ہے کہ شعر میں سوز کہاں سے آتا ہے۔؟

شعررا سوز از کجا آید بگوئے
از خودی یا از خدا آید بگوئے

بھرتری ہری نے بتایا کہ ہمارے روح کی ساری لذت اور راحت جستجو پر موقوف ہے۔ لہذا جس شاعر کے دل میں جستجو کا جذبہ کارفرما ہے۔ اس کے کلام میں سوز و گداز کا رنگ پیدا ہونا لازمی ہے۔

جان مارا لذت اندر جستجو ست
شعررا سوز از مقام آرزوست

آگے چل کر زندہ رود کی گذارش پر یہ فلسفی یوگی شاعر اہل ہند کو جہد و عمل کا پیغام دیتا ہے۔ جس کا خلاصہ یہ ہے ۔

پیش آئین مکانات عمل سجدہ گذار
زانکہ خیز دزعمل دوزخ واعراف وبہشت

جاوید نامہ میں فلک قمر کے ایک غار میں پہلی روح جو اقبال اور ان کے رہنما رومی کو نظر آتی ہے۔ ہندوستان کے ایک قدیم عارف وشوامتر کی ہے جسے اہل ہند نے ''جہاں دوست'' سے موسوم کیا ہیں۔ ملاقات کا ذکر کرتے ہوئے شاعر کہتا ہے وہاں (غار میں) ایک درخت کے نیچے ایک ہندی نژاد عارف بیٹھا ہوا تھا۔ وہ عریاں بدن تھا اور بالوں کا جوڑا اس کے سر پر بندھا ہوا تھا اور اس کے گرد ایک سفید سانپ

حلقہ زن تھا۔ عارف ہندی نے شاعر کے متعلق اس کے رہنما سے پوچھا کہ یہ کون شخص ہے؟ مجھے اس کی نگاہوں میں جاوداں ہونے کی آرزو نظر آتی ہے۔

گفت بارومی کہ ہمراہ تو کسیت؟
درنگا ہش آرزوئے زندگیست

دونوں اسلامی شعراء سب سے پہلے اسی ستاد کامل کی زبانی عالم کی حقیقت اور معارف سے آشنا ہوتے ہیں۔ جہاں دوست نے بتایا کہ عالم رنگ ہے یعنی تعینات اور تقیدات کا مجموعہ ہے جبکہ حق بے رنگی کا نام ہے۔ یعنی تمام تعینات وتقیدات سے آزاد او بالاتر۔ شاعر اور اس کے رہنما رومی سے عارف ہندی (وشوامتر) سے ملاقات، فلسفیانہ مسائل پر گفتگو عارف ہندی کا شاعر کی علمیت واستعداد کا امتحان لینا اور جواب سن کر شاعر کو قیمتی اور علمی نکات سمجھانا، یہ پوری تفصیل اقبال کے احترام آدمیت اور وسعت قلبی کا ترجمان ہے۔

غرض یہ کہ دونوں فنکاروں نے شخصیات کے انتخاب میں رنگ ونسل، مذہب وملت کے اعتبار سے کسی قسم کا افتراق نہیں کیا بلکہ دونوں کے نزدیک شاعرانہ صلاحیتوں کا اصل مقصد خیر کی عظمت کا اعتراف ہے اور یہی سچی دانشوری ہے۔

مختصر یہ کہ دونوں فنکاروں کے کلام میں حب الوطنی اور وطنیت کے جذبوں کی کمی نہیں

دونوں نے اپنے ملک کی عظمت کے راگ الاپے ہیں۔ یہاں کے پہاڑوں، ندیوں اور مذہبی شخصیات سے عقیدت مندی دونوں کے یہاں ملتی ہے اور ایسے وطن کی عظمت رفتہ کا اظہار بھی۔ دونوں کے یہاں ہندوستان کی غلامی کی زنجیروں کو یقین محکم اور عمل پیہم سے کاٹ پھینکنے کا عزم ہے۔ اور ہندوستان کی آزادی کی تمنا بھی، جہاں تک دونوں کے تصور وطنیت کا سوال ہے۔ اس سلسلے میں بھی دونوں کا نظریہ بھی یکساں تھا۔ دونوں نے وطن کے مادی تصور جو جغرافیائی حدود سے وابستہ ہے کی مخالفت کی ہے۔ دونوں اس وطنیت کے قابل نہیں جو سیاسی مصلحتوں کی بناء پر ہوتی ہے جس میں اللہ کے بندوں کو جغرافیائی قوموں میں تقسیم کر کے آپس میں ایک دوسرے سے لڑا بھی دیا جاتا ہے۔ دونوں وطنیت کے اس تصور کے مضر اثرات کو محسوس کر رہے تھے۔ ٹیگور نے اپنی نظم ''پرواسی'' میں اپنے نظریے کا نچوڑ ان الفاظ میں پیش کیا ہے۔ جو تعمیری بھی ہے اور انسانی دوستی کا ضامن بھی کہتے ہیں:۔

''سبھی جگہ میرا گھر ہے اور سنسار کے سبھی حصوں میں میرا وطن ہے۔ تمام نوع انسانی میں روح وحدت کا احساس بڑے سندر ڈھنگ سے ہمارے قومی ترانے میں ظاہر ہوا ہے۔ .....میں نے اپنے دل کی گہرائیوں میں انسانوں سے محبت کی ہے۔ اسی تصور نے میری کشتی حیات کے بادباتوں میں خوشگوار ہواؤں کی طرح حرکت پیدا کی ہے۔ بادباں کبھی ادھر اور کبھی ادھر رخ موڑ رہے تاہم یہ تموج کسی تصنیف کی حد بندیوں سے بالاتر ہی رہا ہے۔'' (پروباسی چیت، ۱۲۳۵)

ان اشعار سے ٹیگور کا نہ صرف تصور وطنیت اجاگر ہوتا ہے بلکہ تصور انسانیت کی تشریح و تعبیر بھی ہو جاتی ہے۔ جہاں تک اقبال کے تصور وطنیت کا معاملہ ہے ہم کہہ سکتے ہیں کہ شاعر مشرق جارحانہ وطن پرستی کے شدید مخالف تھے۔ وہ اس نظریے کے حامی تھے۔

ہو قید مقامی تو نتیجہ ہے تباہی
رہ بحر میں آزاد وطن صورت ماہی
ہے ترک وطن سنت محبوب الٰہی
دے تو بھی نبوت کی صداقت پہ گواہی

گفتار سیاست میں وطن اور ہی کچھ ہے
ارشاد نبوت میں وطن اور ہی کچھ ہے

تصور وطنیت کے معاملے میں بھی دونوں فنکاروں کے نظریے میں مشابہت کے پہلو اجاگر ہوتے ہیں۔ دونوں وطنیت کے ایسے آفاقی نظام کے علمبردار ہیں جو اخلاق اور روحانی اقدار پر مبنی ہو جو اخوت اور اتحاد بشری اور قوموں کے باہمی امن وآشتی پر استوار ہو اور جس میں عظمت انسانی کا بول بالا ہو، ٹیگور کا تصور وطنیت بھی اسی ہمدردی اور وحدت انسانی پر سچے یقین کی تلقین کرتا ہے۔ ٹیگور کا نظریہ جہاں اپنشدوں کی عظیم روحانی خیالات کے حصول کا متمنی ہے تو اقبال اس کے داعی ہیں کہ وطن کا مادی تصور اخلاق باختہ ہونے کے ساتھ ساتھ محدود بھی ہے۔ لہذا وطن کے تصور کو مادی حدود کے شکنجے سے نکال لیا جائے تو یقیناً یہ تصور تعمیری، تخلیقی اور ارتقائی تحریکات کا سرچشمہ بن جائے گا۔

ٹیگور اور اقبال کی شاعر کا یک ہم موضوع 'انسان' ہے۔ دونوں شاعروں کے نزدیک کسی تہذیب کا اعلیٰ معیار یہ ہے کہ اس میں انسانی فضلیت کو تسلیم کیا جائے۔ معاشرت میں جب تک فرد کی اہمیت تسلیم نہیں کی جائیگی، معاشرہ مہذب اور ترقی یافتہ کہلانے کا حق دار نہیں۔ دونوں عظیم شعراء اس نظریے کے علمبردار رہے کہ آدمی کا مقام ساری کائنات سے بلند و برتر ہے۔ ساتھ ہی کسی بھی قوم کی تعمیر وتہذیب کا انحصار فرد کی تعمیر وتہذیب پر موقوف ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انسانی آزادی جس میں آزادی فکر وعمل بھی شامل ہے کا پیغام دونوں فنکاروں نے دیا۔ ٹیگور نے اپنی شاعری کے ذریعہ فلسفہ انسانیت کا جو تصور پیش کیا ہے اسے ہم انسانی مسرت اور عالمی اخوت کے منشور سے تعبیر کر سکتے ہیں۔ ان کی نظم مانسی، سونارتری، ودیا، دردر، مکتی، گتی، وشونرتیہ میں انسانوں سے ہمدردی کے وہ بے حد آرزومند ہیں۔ اپنے شعری مجموعہ 'سونارتری' میں کہتے ہیں:۔

''انسان میرے دل کے قریب پہنچ گیا ہے اور اس نے مجھے بیدار کیا ہے، میں نے ان لوگوں کے سلسلے میں سوچا، کام کیا، کئی فرائض سامنے آئے اور ان فرائض سے آج بھی میرا خیال بچھڑا نہیں ہے۔ انسان سے قریب آنے پر میری زندگی میں ادب کا راستہ اور میرے کام کا راستہ دونوں ساتھ ساتھ آگے بڑھنے لگے۔''

ٹیگور کی اسی انسان دوستی اور روحانی واخلاقی پیغام نے عالم انسانیت کو متاثر کیا۔ انہوں نے تنگ نظری، مذہبی کٹر پن، نفرت پسندی، فرقہ پرستی کی کھل کر مخالفت کی۔ ان کے اس نظریے کی تائید ایک مضمون کے اس اقتباس سے بھی ہوتی ہے جو ۱۹۳۱ء میں بنگلہ ماہنامہ ''پرباسی'' میں شائع ہوا۔

''ہندو اپنے آپ کو اپنے مذہب کا اور مسلمان اپنے مذہب کا پابند کہتے ہیں۔ اس طرح دونوں کی زندگی کا بہت کم حصہ مذہب، کے دائرے سے باہر رہتا ہے۔ اس لئے یہ دونوں اپنے اپنے دھرم کے نکتہ نظر سے ایک دوسرے کو اور پھر جہاں تک ہو سکے دنیا کے دوسرے لوگوں کو بھی حتی الامکان دور ڈھکیل دیتے ہیں..... اس سے ان میں انسانیت کا پھیلاؤ ہونے میں رکاوٹ پڑتی ہے۔''

اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ ٹیگور انسان دوستی کو ہر حال مقدم سمجھتے ہیں۔ اخوت اور بھائی چارگی کا بین الاقوامی تصور کے وہ علمبردار رہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اپنے پیغام کو تمام عالم انسانیت میں فروغ دینے کا عزم رکھتے ہیں۔ بلا امتیاز رنگ ونسل، مذہب وملت سبھوں میں انسانیت کا صور پھونکنے کا حوصلہ ٹیگور کے یہاں پایا جاتا ہے۔ دیکھئے یہ اشعار۔

آؤ، آؤ، آریہ آؤ
آؤ، غیر آریہ آؤ
آؤ۔ ہندو اور مسلمان
چلے آؤ۔ اے انگریز، آج تم بھی چلے آؤ
آؤ، آؤ اے عیسائی
اور اے برہمن، دل صاف کر کے تم بھی چلے آؤ
آؤ۔ اور سب کا ہاتھ تھام لو

یہ تمام اشعار شاعر کی انسان دوستی کے ضامن ہیں۔ انسانیت سے اس خلوص ومحبت کے جذبے نے ٹیگور کی شاعری کو معراج عطا کیا ہے۔ انہوں نے اپنی شاعرانہ ضاعیوں کے ذریعہ انسان اور انسانیت کے ہر اعتبار سے اعلیٰ وارفع مقام عطا کرنے میں جو کلیدی رول ادا کئے ہیں

اس کا اعتراف ہر عہد میں ہوتا رہے گا۔

جہاں تک اقبال کی شاعری میں انسان کا مقام کی تعین قدر کا معاملہ ہے ہم کہہ سکتے ہیں کہ اقبال کی پوری شاعری کا ماحصل انسانیت کا احترام، اس کی فضلیت کا اعتراف اور آدمیت کی تکمیل ہے۔ جس کی تشریح وتعبیر شاعر مشرق نے ایک شعر میں اس طرح کی ہے۔ ؎

آدمیت احترام آدمی
باخبر شو از مقام آدمی

لہذا وہ ایک ایسے معاشرے کے داعی ہیں جس میں انسان مساوات اور اخوت کی بنیاد پر اخلاقی وانسانی شرافتوں اور فضیلتوں کی انتہا کو پالے اور وہ غیر سماجی و غیر اخلاقی امتیازات ختم ہو جائیں جن کی وجہ سے ایک انسان دوسرے انسان کی جان لینے پر درپے ہو جاتا ہے

☆☆☆

گرم ہو جاتا ہے جب محکوم قوموں کا لہو
تھرتھراتا ہے جہانِ چار سُو و رنگ و بُو
پاک ہوتا ہے ظن و تخمیں سے انساں کا ضمیر
کرتا ہے ہر راہ کو روشن چراغِ آرزو
وہ پُرانے چاک جن کو عقل سی سکتی نہیں
عشق سیتا ہے انھیں بے سوزن و تارِ رفو

محمد ریاض

ڈاکٹر این میری شمل کی اقبال شناسی

پروفیسر ڈاکٹر این میری شمل (ولادت ۱۹۲۳ء) کی عالمی شہرت یافتہ جرمن مستشرق ہیں ۔ وہ شرق وغرب کی متعدد اہم زبانیں جانتی ہیں ۔ وہ مغربی جرمنی ، امریکہ اور ترکی میں تدریس کرتی رہیں ۔ انگریزی ، جرمن اور ترکی زبانوں میں ان کی متعدد تصانیف ہیں ۔ وہ ۱۹۵۸ء سے اب تک کئی بار پاکستان تشریف لاتی رہی ہیں ۔ برصغیر کے تمدن اور اسلامی تہذیب وثقافت کے بارے میں ان کے وسیع مطالعے کا بڑا شہرہ ہے ۔ اٹھارویں صدی عیسوی کے دو نامور صوفیاء اور شعراء حضرت شاہ عبداللطیف بھٹائی اور حضرت خواجہ میر درد دہلوی کے فکر وفن کا عمیق مطالعہ ان کی انگریزی تالیف Pain and Grace سے ہویدا ہے ۔ رومی اور اقبال کے فکر وفن کی وہ متخصص مانی جاتی ہیں ۔ رومی کے آثار دیوان کبیر ، مثنوی اور مافیہ وغیرہ کے مطالعہ پر مبنی ، ان کی ضخیم کتاب ، The Triumphal Sun سے ابھی زیادہ لوگ آگاہ نہیں ۔ یہ ایک فکر انگریز کتاب ہے ۔ اقبال کی کئی کتابوں کو انہوں نے ترکی اور جرمن میں ترجمہ کیا ۔ انہوں نے متعدد تحقیقی مقالے لکھے ۔ جرمن اور انگریزی میں اقبال کے بارے میں ان کی ایک جامع کتاب بھی دستیاب ہے ۔ انگریزی کتاب کا عنوان Gabriel's Wings ہے جس کی ذیلی سرخی ہے ۔ ''اقبال کے دینی افکار'' لوگ اسے عرف عام میں ''بال جبریل'' کا ترجمہ جانتے ہیں حالانکہ بال جبریل عنوان سے جزوی ترجمہ مدتوں بعد ایک دوسرے مترجم نے پیش کیا ہے (۱) ڈاکٹر شمل کی اس کتاب کا اردو ترجمہ راقم نے ''شہپر جبریل'' کے عنوان سے کیا تھا جو خاصاً متداول ہے ۔ (۲) گبرئیلز ونگز'' پہلی بار ۱۹۶۳ء میں ہالینڈ سے شائع ہوئی تھی ۔ ان ہی سالوں میں مصنفہ نے تعارف نامے کے ساتھ اس کتاب کا دوسرا (پاکستانی عکس) اڈیشن اقبال اکاڈیمی پاکستان نے لاہور سے شائع کیا ہے ۔

ڈاکٹر این میری شمل فروری ۱۹۵۸ء میں پاکستان فیڈرل جرمن فورم کراچی اور جرمن سفارت خانے کی دعوت پر پاکستانی پہلی بار آئیں۔ان کے مقالے فورم کی طرف سے شائع کردہ کتاب ''محمد اقبال'' انگریزی ،۱۹۶۲ء میں شامل ہیں۔اس سے قبل وہ علامہ اقبال کی دو کتابوں کا ترجمہ شائع کروا چکی تھیں۔

جاوید نامے کا ترکی منثور ترجمہ۔استنبول ۱۹۵۵ء اور اس کتاب کا جرمن منظوم ترجمہ' جون ۱۹۵۷ء۔حکومت پاکستان نے موصوفہ کو اعلیٰ اعزازت سے نوازا اور اس ملک کی کئی یونیورسٹیوں نے انہیں ڈاکٹریٹ کی اعزازی اسناد بھی پیش کیں۔وہ حکومت پاکستان اور بعض محترم اداروں کی دعوت پر پاکستان تشریف لاتی رہی ہیں۔

ڈاکٹر این میری شمل کی پاکستان بلکہ دوسرے ممالک میں بیشتر شناخت ''اقبال شناس'' کے طور پر ہے یوں تو وہ شرق وغرب کے ان بیشتر منابع کی ناظر رہی ہیں جو اقبالیات کا خاصہ ہیں ۔مگر اقبال کے سوانح ان کے افکار اور وہ شرق وغرب کے ان بیشتر منابع کی ناظر رہی ہیں جو اقبالیات کا خاصہ ہیں ۔مگر اقبال کے سوانح ،ان کے افکار اور تصانیف وآثار کی جزئیات پر ڈاکٹر شمل نے جس طرح نظر رکھی ہے وہ تعجب انگیز ہے۔برصغیر خصوصاً پاکستان میں اقبال شناسی کی جملہ جزئیات پر نظر رکھنا ،نادر وبدیع کام نہیں مگر مستشرقین یا برصغیر سے باہر کے لوگ بالعموم اقبال کی زندگی اور فکر وفن کے اہم تر امور میں دلچسپی لیتے رہے ہیں مگر یہ مستشرق اس معاملے میں مستثنیٰ ہیں ان کے ہاں اقبال شناسی کی بوقلمونی اور رنگارنگی کا بھی یہی حال ہے۔

۱۹۷۷ء میں پاکستان جرمن فورم نے ہمبورگ سے ایک کتاب شائع کروائی۔اس میں انگریزی اور جرمن زبان میں اقبال کے صد سالہ یوم ولادت کی مناسبت سے مقالات شامل ہیں۔ کتاب کا عنوان بزبان انگریزی ،اس طرح ہے:

Muhammad Iqbal and the three Realms of th Spirit

مصنفہ کے نزدیک فکر اقبال کے اقانیم ثلاثہ برصغیر کا نژاد ،اسلامی علمی ورثہ اور عالمی تفکر وتغلف ہے۔اس مجموعے میں ڈاکٹر شمل کے مقالات اقبال کے سوانح ،جرمنی سے ان کا تعلق ،ہند اسلامی تصوف کی اصلاح کے لئے ان کی کوشش ،شعر اقبال کے شرقی وغربی عناصر اور علامہ مرحوم

کے تصور ابلیس کے بارے میں ہیں۔ڈاکٹر شمل نے فکر اقبال کی عصری اہمیت، حسین ابن منصور حلاج کے اقبال پر اثرات، رومی و اقبال اور حضرت علامہ کے تصور عقل و عشق وغیرہ پر'' پاکستان کوارٹرلی'' اور'' اقبال ریویو'' میں مبسوط مقالے لکھے۔ان میں سے اکثر'' ماہ نو'' میں ترجمہ ہو کر شائع ہوئے۔رومی پر لکھتے وقت بھی مصنفہ کے قلم کا زور اقبال پر ٹوٹتا رہا ہے اس کی ایک مثال ان کا مقالہ'' ادبیات شرق و غرب پر رومی کے اثرات'' ہے۔جرمن متن کی رو سے مقالہ فارسی میں ترجمہ ہو کر طبع ہوا راقم کا اردو ترجمہ ماہنامہ'' فکر و نظر'' اسلام آباد میں طبع ہوا تھا۔(فروری ۱۹۷۹ء برصغیر میں رومی شناس کی مساعی میں اقبال کے مقام پر ڈاکٹر سید محمد عبداللہ مرحوم اور ڈاکٹر افضل اقبال نے بھی لکھا ہے۔مصنفہ کے نزدیک فکر اقبال لوگوں کو دین کی افادیت اور روحانیت کے فروغ کی غایت سمجھانے کی خاطر اہم دینی کتب کی طرح محرک اور مشوق رہے گا۔ڈاکٹر شمل نے فرانسیسی مستشرق لوئی ماسینون (وفات ۱۹۶۲ء) کی اقبال سے گفتگو کے حوالے سے بجا لکھا ہے کہ اقبال وحدت الوجودی نہ تھے۔وہ شیخ علاء الدولہ بیابانکی سمنانی (۷۳۶ھ) میر سید علی ہمدانی شاہ ہمدان (۷۸۶ھ) اور شیخ احمد فاروقی مجدد الف ثانی (۱۰۳۴ھ) کی طرح وحدت الشہودی تھے۔ڈاکٹر شمل نے ابن حلاج کی کتاب الطواسین کے حوالے سے اقبال کے انا الحق کے تصور سے تعرض کرنے اور بعد میں موافقت برتنے سے کئی مضامین میں بحث کی ہے۔ان کی بحثوں کا حاصل یہ ہے کہ انا الحق، اظہار خودی کا ہی ایک نعرہ و دعویٰ تھا۔اسی لئے اقبال کو کتاب الطواسین اس قدر محبوب تھی اور حسین ابن حلاج سے ان کا گہرا لگاؤ رہا ہے۔اس سلسلے میں اقبال کے اعترافات بھی ہیں۔ابن حلاج، اقبال کو کہتے ہیں۔

آنچہ من کردم تو ہم کردی ، بترس
محشرے بر مردہ آوردی ، بترس

(یعنی میں نے اعلان انا الحق سے جو کچھ کیا تھا وہی تو نے اظہار خودی سے کیا ہے۔تو نے مردوں کو یوم قیامت دکھا دیا اور انقلاب برپا کر دیا۔میرے جیسے انجام سے تم بھی ڈرو) ایک اردو قطعے میں اس ضمن میں سنائی اور رومی محو گفتگو دکھائی دیتے ہیں

فردس میں رومی سے یہ کہتا تھا سنائی
مشرق میں ابھی تک ہے وہی کاسہ وہی آش

حلاج کی لیکن یہ روایت ہے کہ آخر
اک مرد قلندر نے کیا راز خودی فاش

اقبال کو عطار، ملٹن اور زکریا قزدینی وغیرہم کی طرح ابلیس اور اس کی اولاد شیاطین سے بے حد دلچسپی رہی ہے۔ مبارزہ و پیکار اور خیر و شر کی آویزش یوں بھی اقبال کے تصور خودی کے ضروری اجزا ہیں۔ اس ضمن میں اطالوی پروفیسر آنجہانی ایسندرو بوزانی اور ڈاکٹر شمل نے مفصل بحثیں کی ہیں۔ یہ مصنف اقبال کی اس ندرت فکر کے قدر دان ہیں کہ وہ پیکار و مبارزے کے ذریعے نیکی کی قوتوں کو برائیوں پر غالب کرنے کے آرزومند رہے تھے۔

بزم بادیو است آدم را زوال
زرم بادیو است آدم را کمال
خویش رابر اھرمن باید زدن
توہمہ تیغ آن ہمہ سنگ فسن

(جاوید نامہ، آنسوئے افلاک)

ڈاکٹر شمل نے اقبال کے تصور عشق کا خوب خوب ادراک کیا ہے۔ اقبال کے ہاں عشق کئی معانی کا حامل ہے۔ ان میں ایک معنیٰ اشراق قلب یا تزکیۂ نفس کے بھی ہیں۔ یہ پیغمبرانہ شان کا مظہر جذبہ ہے۔ عشق، کسی توصیف و صلے کی توقع کے بغیر خدمت انسانی کی سعی کا نام ہے۔ ڈاکٹر شمل کی ایسی بحثیں پڑھتے وقت نظم ''مسجد قرطبہ'' کے اشعار کی طرف توجہ مبذول ہوتی ہے کہ

عشق دم جبرئیل ، عشق دل مصطفیٰؐ
عشق خدا کا رسول ، عشق خدا کا کلام
عشق کی مستی سے ہے پیکر گل تابناک
عشق ہے صہبائے خام ، عشق ہے کاس الکرام
عشق فقیہہ حرم ، عشق امیر جنود
عشق ہے ابن السبیل ، اس کے ہزاروں مقام
مرد خدا کا عمل عشق سے صاحب فروغ

عشق ہے اصل حیات ،موت ہے اس پر حرام
تند و سبک سیر ہے ، گرچہ زمانہ کی رو
عشق خود ایک سیل ہے ، سیل کو لیتا ہے تھام
عشق کی تقویم میں عصر رواں کے سوا
اور زمانے بھی ہیں جن کا نہیں کوئی نام

ڈاکٹر شمل کی تحریک پر ایک ایرانی اسکالر نے اقبال کے ڈاکٹریٹ کے مقالہ ''ایران میں مابعد الطبیعات کا ارتقاء'' کا جرمن میں ترجمہ کیا اور موصوفہ کے مقدمے کے ساتھ جرمنی سے شائع کروایا ہے۔

جاوید نامہ اقبال کا فارسی شاہکار ہے جس کے کوئی ساڑھے اٹھارہ سو اشعار ہیں۔ یہ ادبی انداز میں شاعر (زندہ رود) کا خیالی افلا کی سفر نامہ ہے جو جزواً، الیغیری، دانتے اطالوی (۱۳۲۱) کی ''ڈیوائن کمیڈی'' کی شبیہ ہے۔

اقبال نے اسے ''حاصل حیات'' بنانے کی سعی کی ہے۔ اس کتاب میں اقبال کے جملہ افکار عمدگی سے سمٹ آئے ہیں اور اس کی تخلیق میں علامہ کی کئی سالوں کی محنت اور مطالعہ شامل ہے۔ ڈاکٹر شمل نے اس کتاب کو کئی زبانوں میں ترجمہ کیا اور سالہا سال ہارورڈ یونیورسٹی میں اس کے مباحث پر لیکچر دیئے ہیں۔ ۱۹۶۲ء میں بھی اس کتاب کے بارے میں ان کی خاص معلومات تھیں جیسا کہ ان کی اس سال لکھی جانے والی کتاب کی ذیل میں ترجمہ شدہ سطور سے واضح ہے:

''۱۹۳۲ء میں ہی اس شستگی ناپذیر شاعر نے اپنے بیٹے ''جاوید'' کے نام کی مناسبت سے جاوید نامہ کی ایک کتاب فارسی میں شائع کی۔ اقبال کو طالب علمی کے عہد سے ملٹن کی ''فردوس گم گشتہ'' کے اسلوب میں ایک کتاب لکھنے کا خیال تھا۔ وہ کئی منظومات اور تصانیف میں افلا کی مناظر پیش کرتے رہے ہیں۔ ۱۹۱۶ء میں وہ ''اقلیم خاموشاں'' نام کی ایک نظم لکھنے کا عزم ظاہر کرتے نظر آتے ہیں۔''

اس کا مقصد یہ دکھانا ہوگا کہ مردہ قومیں دنیا میں کیا کرتی ہیں۔ ان کے عام حالات، جذبات وخیالات کیا ہوتے ہیں (اقبال نامہ ج ۱۷۳)

جاوید نامے کا افلا کی سفر کوئی بے نظیر تصور نہیں ۔ عالمی ادب میں دوسری دنیاؤں کی باتیں موجود ہیں ۔ اسلامی تصوف کی تاریخ میں کافی پہلے سے عالم بالا کی طرف روحانی سفر کی روایات موجود رہی ہیں ۔ اقبال نے موجود و نا موجود نیز زمان اور جاویدانیت پر بہت غور کیا ۔ انہوں نے مسلمانوں کے شاندار ماضی سے ہی گرمی قلب حاصل نہ کی ۔ انہیں ان کے مستقبل سے بھی خوش آئند امیدیں تھیں ۔ یہی وجہ ہے کہ جاوید نامہ میں ان کے افکار زیادہ واضح اور صریح ہو گئے ۔ ۱۹۳۱ء میں انہوں نے اس کتاب کے بارے میں لکھا ۔

''یہ ایک قسم کی ڈیوائن کمیڈی ہے اور مثنوی مولانا روم کے طرز پر لکھی گئی ہے ۔ اس کا دیباچہ بہت دلچسپ ہوگا اور اس میں غالباً ہند و ایران بلکہ تمام دنیائے اسلام کے لئے نئی باتیں ہوں گی'' ۔ (اقبال نامہ ح اصفحہ ۲۱۶)

اقبال دانتے کی ڈیوائن کمیڈی کے علاوہ دیگر افلا کی سفروں سے بخوبی واقف تھے ۔ اس لئے انہوں نے اس نیم ڈرامائی نظم میں اپنے جملہ سیاسی فلسفیانہ نقطہ ہائے نظر کو نہایت عمدگی سے بیان کیا ہے ۔ وہ تقریباً ۱۹۳۰ء سے مسلم صوفیا اور دانشوروں سے افلاک کے بارے میں معلومات جمع کرتے رہے ۔ مثلاً محمد غوث گوالیاری کا رسالہ جس میں افلا کی سفر کا بیان ہے یا کسی علامہ عبد العزیز کی تالیف سر السماء ، وہ ان کتابوں کو سائنسی اور علمی مقاصد کے لئے پڑھنا چاہتے تھے مگر بعد میں انہیں معلوم ہوا کہ ان میں روحانی تجارب کا بیان ملتا ہے ۔ لکھتے ہیں ۔

''وہ کتب جو مشاہدۂ روحانی یا وحی والہام کی بناء پر لکھی گئی ہیں'' ۔ اکثر مسلم صوفیا نے آسمانوں کے سفر سے اس انداز میں بحث کی ہے (اقبال نامہ حصہ اصفحہ ۲۱۷)

جاوید نامہ بڑے وسیع مطالعات کے بعد لکھی گئی اور یہ فارسی کی ایک حیرت ناک کتاب ہے ۔ اس کے شروع میں گوئٹے کے فاؤسٹ کے اسلوب پر آسمان کا زمین کے لئے ایک ''ملامت نامہ'' ملتا ہے پھر رومی اور اقبال کی ملاقات کا منظر ہے ۔ رومی ، قدیم ایران کے خدائے زمان و مکان کی مدد سے وقت کا جادو توڑتے ہیں اور دانتے کے ورجل کی طرح اقبال کی رہنمائی کرتے جاتے ہیں ۔ مختلف افلاک کے مباحث میں شاعر کہیں پرانے ستارہ شناسوں کے ہم آہنگ نظر آتا ہے اور کہیں نئے افکار خیالات کو پیش کرنے والوں سے ہے ۔ مگر شاعر بہر صورت مصلحین

جیسے سید جمال الدین افغانی اور سعید حلیم پاشاہ کے ساتھ ملاقات کے ذریعہ اپنے نئے فلسفیانہ اور دینی افکار پیش کرنے کے سعی بلیغ کرتا نظر آتا ہے۔ شاعر ابن حلاج اور قرۃ العین طاہرہ جیسے آزاد، بنگال کے میر جعفر اور میسور کے میر صادق ایسے غداروں، جنگجو بادشاہوں، لارڈ کچز اور نٹشے وغیرہ کی روحوں سے ملتا ہے۔ ان ملاقاتوں میں شاعر نے مشرق و مغرب کے فلسفلہ و مذہب کی تاریخی معلومات ہی پیش نہیں کیں اس نے معاصر مغربی مدنیت کی نفسیات بھی بتائی ہیں۔ کتاب کی ہیئت مثنوی میں لیکن کہیں کہیں غزلیں وغیرہ بھی نظر آتی ہیں۔ یہ باقی متن سے متفاوت ہیں کیوں کہ انہیں اقبال نے اپنی متقدم کتابوں خصوصاً ''زبور عجم سے لے کر یہاں درج کیا ہے۔ شاعر کو اس کتاب کی اہمیت کا احساس تھا اور ایک موقع پر اسے مصور کرنے کے حوالے سے لکھتے ہیں۔

''مترجم کا اس سے یورپ میں شہرت حاصل کر لینا یقینی امر ہے'' (اقبال نامہ ح اصفحہ ۳۰۰)

جاوید نامے میں اقبال نے اپنا قلمی نام ''زندہ رود'' (دریائے رواں) رکھا ہے۔ یہ نام بڑا معنیٰ خیز ہے کیوں کہ اقبال نے پیغمبرانہ مشن کے بیان کے لئے اس تعبیر سے استفادہ کیا ہے۔ گوئٹے نے بھی پیغمبر اسلام حضرت محمدؐ کے لئے ایسی ہی تعبیر سے کام لیا ہے اور اس کی نظم کو اقبال نے فارسی میں منتقل کر کے (جوئے آب کے عنوان سے) پیام مشرق میں شامل کیا ہے۔ اقبال نے دریاؤں اور ندیوں کی روانی اور ان کے زریعے پہاڑوں کے ٹکڑے ٹکڑے ہوتے رہنے اور ''جوئے آب'' سے ممزوج ہونے کا کئی دوسری نظموں میں بھی ذکر کیا ہے (شہپر جبریل صفحہ ۷۶۔۷۷ بالتعبیر)

کوئی ربع صدی بعد وہ اس کتاب کے فکری جذب و تاثر اور اقبال کی ''مستقبل بینی'' سے حیرت و استعجاب حاصل کرنے کا مزید اعتراف کرتی نظر آتی ہیں۔ قارئین ''گبریلز ونگ'' کے دوسرے ایڈیشن کے دیباچہ مولفہ کا ترجمہ ملاحظہ کریں۔ جو ۲۱ اپریل ۱۹۸۸ء کو لکھا گیا۔

''۲۵ برس گزر گئے جب علامہ اقبال کی پچیسویں برسی کے موقع پر ''گبریلز ونگ'' پہلی بار لیون سے شائع ہوئی تھی۔ اس کی اشاعت ثانی عرصے کے بعد ہو رہی ہے مگر مجھے امید ہے کہ یہ اب بھی پاکستانی اور غیر پاکستانی قارئین کے لئے مفید ہوگی۔ اس بات کے تذکرے کی ضرورت نہیں کہ اس صدی کی آخری چوتھائی کے آغاز سے اقبال کے بارے میں بہت لکھا جانے لگا جس

میں ڈاکٹر جاوید اقبال کی ضخیم اردو سوانح عمری شامل ہے۔شاعر کے فلسفہ کے مختلف سیاسی اور معاشرتی فکری موضوعات کے بارے میں متعدد کتابیں اور مقالے طبع ہوئے۔تجدید ناپذیر مواد کے باوجود مجھے توقع ہے کہ میری اس کتاب کی قدر و قیمت باقی رہے گی کیوں کہ یہ اقبال کو مذاہب کی تاریخ عامہ کے آئینہ میں پیش کرتی ہے۔یوں اقبال اگر بیسویں صدی عیسوی کے سب سے معتبر مفکر اور شاعر نظر نہ آسکیں تو بھی ہم انہیں انتہائی دلآویز اور جاذب شخصیت ماننے کے قابل ضرور ہو جاتے ہیں۔اقبال تاریخ مذہب کی رو سے، پیغمبرانہ، تجربے کی ایک نمونے کی مثال ہیں۔اس تجربے نے انہیں نت نئی رفعتوں کا حامل بنایا تھا۔اقبال کا باز یا شاہین کا تصور عبث نہ تھا۔یہ روح کے نئے آفاق کی تلاش کرنے کی ان کی محبوب علامت ہے۔شاہین ان کے ہاں باغ و بستاں کے حزن پیشہ بلبل پر فائق ہے۔اس طرح ان کا محبوب پھول ''گلاب نہیں'' گل لالہ ہے۔گل لالہ خونین کفن شہیدوں کا نمائندہ ہے اور شعلہ صحرائی سے بھی قابل موازنہ ہے۔اس شعلے سے شجر سوزاں کے ذریعہ الہام و وحی ملنے کے واقعہ کی یاد تازہ ہوتی ہے''۔

جیسا کہ اقبال نے جاوید نامہ کے فلک عطارد میں کہا ہے۔ان کا مقصد روحانی موت سے دو چار انسانوں کو زندہ کرنا تھا۔اس بات سے وہ اپنے ہم مذہب افراد کو ان لامحدود امکانات کی طرف متوجہ کر رہے تھے جو آیات قرآنی میں مضمر ہیں اور کلمۃ اللہ قارئین کے لئے نئی دنیائیں پیش کرتا ہے۔اس سلسلہ میں شاہ ولی اللہ محدث کی خدمت کی طرف توجہ مبذول ہوتی ہے انہوں نے قرآن مجید کا فارسی میں ترجمہ کیا تا کہ لوگ اس منبع فیض سے مستفید ہوں اور ان تفاسیر اور حواشی ،تفاسیر سے برحذر رہیں جنہوں نے زندہ کلام اللہ کو مستور کر رکھا تھا۔

''گبرئیلز ونگ'' کی اشاعت اور اس کے بعد میں نے اقبال کا مطالعہ جاری رکھا اور اس کام سے مجھے نئے بصائر ملتے رہے۔۲۵ سال پہلے جاوید نامہ میں مذکورہ بعض باتیں خیالی معلوم ہوتی تھیں مگر اب انہیں ھارورڈ یونیورسٹی میں جب میں نے طلبہ کے ساتھ پڑھا تو اس شاعری نے ہمیں خاص مسرت و لطف دیا۔حوالے کی خاطر فلک مریخ کا وہ منظر دیکھیں جس میں شاعر حکیم مریخی سے ملاقات کرتا ہے اور وہ اسے وہ چیز سمجھاتا ہے جسے اب شمسی توانائی کہتے ہیں اور وہ ماحول کی آلودگی کا بھی ذکر کرتا ہے۔وہیں ایک جعل ساز نبوت کی دعویدار عورت کا منظر ہے جو

دیارِ فرنگ سے وہاں وارد کی گئی تھی اس کی گفتار کے خلاف انتہائی اقدام کرنے والی تحریکوں اور ٹسٹ ٹیوب بچوں کے عمل کی غماز ہے۔ یہ سب عنوانات آج سب کے لئے عام ہیں۔ اقبال کے یہ اظہارات ان کے قارئین کے لئے کلی طور پر غیر متعلق رہے ہوں گے، لیکن جیسا کہ روڈلف پنوئز نے عمدگی سے کہا ''حقیقی شاعری اپنے عصر پر غور کر کے، مستقبل کی تولید و تکوین ہے''۔

یورپی اور امریکی احباب سے بحث کر کے مجھے اکثر معلوم ہوا کہ انہیں اقبال کی شاعری کا متحرک اور مواج پہلو بہت پسند ہے۔ یہ پہلو تصوف سے اثر پذیر ہو کر مسلم شعراء کے کائنات کے نقطۂ نظر کا مطالعہ کرنے والوں کے ہاں متضاد واقع ہوا ہے۔ مذہب کی پیغمبرانہ شان کی مظہر جلوت اور خلوت کی اقبال کے ہاں بار بار تلقین ملتی ہے۔ خلوت سے نماز و عبادت کا انہماک ملتا ہے جب کہ جلوت، امور عالم کے انصرام سے عبارت ہے۔ یہ طریق کئی صوفیہ کی روش سے مختلف ہے۔ وہ خدا اور روح کے مکالمے پر ہی متوجہ رہتے ہیں۔ جلوت و خلوت کو اقبال نے ''تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ'' کے پانچویں خطبے کے آغاز اور جاوید نامہ کے طاسین زرتشت میں حضرت موسیٰ کلیم اللہ کے حوالے سے واضح کیا ہے۔ علامہ اقبال جانتے تھے کہ اس دنیا کی جلوہ سامانی کے لئے مثبت اور منفی نقاط کا رابطہ ضروری ہے۔ یہ دل کی دھڑکن اور تنفس کے لئے ہیں جنہیں چینی روایت میں ''یانگ اور ین کا امتزاج'' کہا جائے گا۔ آیا خدائے یکتا و مطلق کی صفات میں بھی جمال و جلال اور لطف و قہر ایک ساتھ نہیں ملتے ہیں؟ حسن و جلال اور رحم و عدل بھی اس ماورائے کل کی متاع ہیں۔ اقبال کے ہاں بھی عشق، عقل و علم اور محبت و عقل یا خشک سائنس کے کلمات کی ثنویت اور تضاد اشعار میں تکرار آمیز حد تک وارد ہوئے ہیں اور اس سے ان کے اشعار بآسانی یاد ہو جاتے ہیں۔ اقبال کے روحانی مرشد رومی نے کلمۂ خدا، کن کو ایک جگہ ک۔ ن لکھا اور اس تخلیقی امر کو دو رنگ والے دھاگے سے تشبیہ دی جو اکثر انسانوں کے لئے وحدت وجود کا مظہر ہے اقبال نے یہ استعارہ استعمال تو نہ کیا مگر انہیں یہ یقیناً پسند آتا، زندگی کی متضاد صورتیں انسانوں کو بہر حال تخمین و ظن کی حالت اور خام خیالیوں کے بجائے الہامی صداقت کے مدارج طئے کرتے رہنے کی خاطر کوشاں اور ساعی رکھتی ہیں۔

رومی کے اثرات اقبال کی کئی تحریروں سے ہویدا ہیں۔ (جاوید نامہ میں) اقبال بار بار

اس شفاف راہ کی طرف رجوع کرتے ہیں جو ان کی افلا کی فضاوں میں رہبری کرتے ہیں۔غور وفکر کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اقبال نے زیادہ تر رومی کی شعری تصانیف پر توجہ مبذول رکھی مگر ان پر رومی کی نثری کتاب (گفتار) فیہ مافیہ کا گہرا اثر بھی نظر آتا ہے اگر براہ راست اثرات نہ بھی نظر آئیں تو بھی اقبال کے کئی اظہارات گفتار رومی کی طرف توجہ دلاتے ہیں۔اقبال کی اصطلاح خودی کو قارئین نے غلط سمجھا اور اس کی مخالفت کی تھی۔اس اصطلاح کا منبع بھی فیہ مافیہ نظر آتی ہے مگر یہ کہ اقبال بھی رومی کے سے روحانی تجربے سے دوچار ہوئے ہوں۔فیہ مافیہ کے چوتھے باب میں رومی ایک بادشاہ کی حکایت بیان کرتے ہیں جس نے اپنے ایک احمق بیٹے کو علم نجوم، ہندسے اور تمام مروج علوم سکھائے اور پھر اسے پوچھا کہ اس کی بند مٹھی میں کیا ہے۔شہزادے نے مخفی چیز کو زرد اور گول بتایا اور پھر نتیجہ نکالا کہ یہ چکی ہوگی۔رومی علمائے عصر کو ایسا ہی بتاتے ہیں۔وہ تفصیلات بتاتے ہیں مگر اصل بھول جاتے ہیں یہاں مولانائے موصوف نے لفظ ''خودی'' استعمال کیا ہے۔ زرد بیچ سے خالی اور گول ہونا اس طلائی انگشتری کی صفات تھیں جو کھٹالی میں مضمر رہیں مگر اس کی خودی موجود تھی۔اقبال نے زیر حوالہ عبارت پڑھی ہو یا نہیں۔اہم نکتہ یہ ہے کہ رومی نے انسانی ہستی کی روحانی اور فنا ناپذیر اصل کو ''خودی'' کہا تھا۔

رومی سے اقبال کا رابطہ فلسفہ دعا سے بھی نمایاں ہے۔اقبال کی طرح رومی کے نزدیک بھی دعا و نماز درد تنہائی سے دوچار انسانی ہستی کا مطلق سے رابطہ ہے۔اقبال کی بعض نظمیں فیہ مافیہ میں رومی کی گفتار کی درد کی گونج معلوم ہوتی ہیں۔مثلاً ایسے اظہارات کہ حقیقی نماز کا قیام اس دنیا میں ہے، رکوع دوسری دنیا میں اور سجود حضور حق ہوگا۔قرآن حکیم میں ہے۔واسجد واقترب (۹۶:۱۹) یعنی سجدہ کرو اور قربت پاؤ۔اقبال جانتے تھے کہ راز نماز، دیگر اسرار کی طرح، تحفہ خداوندی ہے یہ وہ پکار ہے جس کا جواب ملے اور بقول رومی (مثنوی رومی، دفتر اول شعر شمارہ ۱۷۴) صرف پیاسا پانی کی تلاش نہ کرے خود پانی کو بھی پیاسے کی جستجو ہو، شاہ عبداللطیف بھٹائی نے بھی رسالوں میں ایک ایسا شعر کہا ہے۔اقبال کی کتاب زبور عجم کی کئی جرأت آموز دعائیہ نظموں میں یہ مضمون بیان ہوا ہے۔

اقبال کو ایک سوانح نگار نے زائر باشوق کہا ہے۔اقبال کے نزدیک زندگی کا ایک لامتناہی سلسلہ ہے، یہ ابدیت کا سفر ہے۔اس میں ایران کے گلستانوں اور بوستانوں کے جلوے ہی نہیں

اور نہ مغربی دنیا کی زرق برق رعنائیاں ہی ہیں بلکہ یہ باغات بہشت سے ہی عبارت نہیں۔ البتہ یہ کوبستانوں اور صحراؤں سے گزر کر حضور حق، کعبۃ اللہ پہنچنے کا راستہ ضرور ہے۔ اقبال کے پہلے اردو مجموعہ کلام کا عنوان، بانگ درا، اس علامت کا مظہر ہے۔ انہیں زنگ شتر سے دلچسپی تھی۔ اس صدا اور شتر سواری سے حج کے عازم اپنے دیار حرمین جا پہنچتے ہیں۔ جاوید نامہ میں شاعر کو رومی نے زندہ رود (دریائے رواں) کا جو قلمی نام دیا ہے، وہ روح نبوت کا مظہر ہے پیغمبر اسلام کو اکثر بار دریائے کبیر کہا گیا ہے۔ انہوں نے کئی چشموں، ندی، نالوں، نہروں اور چھوٹے دریاؤں کو ساتھ ملایا اور اللہ کے حضور پیش ہونے والے اوقیانوس میں شامل فرمایا۔ گوئٹے کی نظم ''نغمہ محمدؐ'' اس اسلامی نقطۂ نظر کی ترجمان ہے۔ اقبال نے پیام مشرق میں اس کا آزاد فارسی ترجمہ نظم کیا ہے اور اس میں پیغمبرانہ جہد و کوشش کا ایک کلاسیکی نمونہ ملتا ہے۔

۱۹۶۳ء کے بعد بہت سی کتابیں شائع ہوئی ہیں جن میں اشخاص کا خاصہ تفصیلی ذکر ہے جیسے جے ایم ایس بلجن کا مطالعہ شاہ ولی اللہ اور وائی، فرائڈن کی شیخ احمد سرہندی کے بارے میں کتاب۔ اقبال کی ابلیس شناسی کے زیر اثر پیٹر جے آون نے ابلیس کے سقوط اور توبہ کے بارے میں ایک اہم کتاب لکھی ہے۔ تحریک خلافت اور مدرسۃ العلماء دیوبند نیز سیاسی، معاشرتی اور مذہبی سوالات جیسے بنیاد پرستی، احیائے اسلام اور ایسے ہی دیگر اہم موضوعات کے بارے میں کافی مواد شائع ہوا۔ بہت سے سیاسی علماء اور ماہرین عمرانیات کو مگر تاریخ اسلام کا ادراک حاصل نہیں بلکہ وہ اس لسانی پس منظر کے معاملے میں بھی کورے ہیں جو جدید اسلامی تفکر کے بعض رجحانات سمجھنے کے لئے ضروری ہیں۔ اقبال کی ادبی عظمت جانچنے کے لئے فارسی ادبی روایات اور ان کے اردو میں تداول کے بارے میں، معلومات ضروری ہیں۔ اس ادبی روایت سے ناآشنا شخص اقبال کے شعری آہنگ و موضوع کی مطابقت کو کیسے نقد و مطالعہ کرے گا۔ اقبال کی شاعری زندگی کی مختلف شئون کی مظہر ہے لہٰذا ان کی فارسی و اردو شاعری کے رموز و علائم کا عمیق مطالعہ ضروری ہے۔

اقبال قارئین کو مرکزی اور عربی رنگ اپنانے کے راغب و داعی رہے۔ البتہ عربی فقہ، فلسفہ اور ادبی روایت سے ملون افراد کے لئے فارسی میراث کا ادراک مشکل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ عرب علماء ابھی اقبال کو صحیح سمجھ نہیں سکے اور روایت پرست دانشوروں کے لئے اس کے فلسفے کا ادراک مبہم رہا ہے۔ مثلاً اقبال خدا کو انائے مطلق یا شخص مطلق قرار دیتا ہے اور عرب لفظ، شخص کی

محدود حیثیت کو خدا سے منسوب نہیں کر سکتے۔

امید ہے کہ کبھی کوئی عرب عالم جو مشرق جہان اسلام کی ادبی وتمدن کی روایات سے آگاہ ہو فکر اقبال کے ساتھ انصاف کرے گا۔

مجھے یہ اعتراف کرنے دیں کہ خود میرے مطالعہ اقبال کا شوق روز افزوں رہا ہے ۔میرے اشتیاق کا آغاز برلن میں دوسری عالمی جنگی کے دوران میرے ایام طالب علمی میں ہوا۔ اس سلسلے میں میں نے جدید مسلم تفکر کے بارے میں کافی کتابیں لکھ کر شائع کروائی ہیں ۔جرمن میں پاکستان کے بارے میں اپنی کتاب (۱۹۶۵ء) کے علاوہ ۱۹۷۷ء میں صومالیہ تقریبات ولادت اقبال کے موقع پر میں نے کئی تراجم اقبال شائع کروائے ۔اقبال جس ملک کے مصور ہیں ۔اس سے میری وابستگی کئی تصانیف سے ظاہر ہے: برصغیر ہند کا کلاسیکی ادب (۱۹۷۴ء) کلاسیکی اردو ادب (۱۹۷۶ء) اور مطالعہ خواجہ میر درد اور شاہ عبداللطیف (۱۹۸۰ء) دیکھ لیں ۔پھر رومی پر میری کتاب ''شمس غالب'' (۱۹۷۸) ہے اور آخر میں، حضرت محمدؐ رسول اللہ (۱۹۸۶ء) اس کا آخری باب علامہ اقبال کی تفہیم نبوت کے موضوع سے مربوط ہے ۔کئی مقامات میں میں نے اقبال کی جدیدیت یا ان کی خاص علامات سے بحث کی ہے ۔میں اب جاوید نامہ کا ایک مبسوط اور شرح متن شائع کروانے کا خواب دیکھ رہی ہوں جس میں شاعر کے سارے آثار منعکس ہوں اور اس کتاب کے لباس سے شرق وغرب کے فکر کے تار و پود نمایاں ہو سکیں ۔(اس کا ترکی ترجمہ توجیحات میں نے ۱۹۵۸ء میں شائع کروایا تھا)

مجھے توقع ہے کہ فکر اقبال پاکستانیوں کو مسلسل نائب حق ہونے کے مقام انسانی کا احساس دلاتی رہے گی تاکہ وہ ''الارض للہ'' کے عقیدے سے سرشار رہ کر اپنے ابنائے نوع کی خدمت کی ذمہ داری نباہتے رہیں گے ۔اقبال نے خود زندگی کی امنگوں سے مالا مال کرنے والے اور انسانوں کو نئی بصیرت اور آدم گیری سکھانے والے شاعر کو ''وارث انبیاء'' قرار دیا ہے اور میری انتہائی آرزو یہی ہے کہ اقبال یہ وظیفہ انجام دینے میں پہلے کی طرح آئندہ بھی قوم کا ''قلب وسینہ'' بنے رہیں۔

ہر تصنیف کسی قدر مصنف کی ذاتی آراء اور میلانات کا شکار ہوتی ہے ۔اس کتاب میں

روزے اور جہاد کے سلسلے میں مصنفہ کی تحریر کمزور اور نارسا ہے۔ جہاد کے سلسلے میں ان کے لئے لکھنا طبعاً مشکل تھا البتہ روزے پر اقبال کا مبسوط خطبہ یا مقالہ جو مقالات اقبال مطبوعہ ۱۹۶۳ء میں شائع ہوا، موصوفہ کو مل نہ سکا تھا اور مثنوی اسرار خودی کے متعلقہ اشعار کا بھی وہ استحسان نہ کر سکیں۔

طبع دوم میں خودی کا ماخذ رومی اور حقیقت دعا و نماز کا زبور عجم میں انعکاس توجہ طلب ہے۔

گفتار رومی کا مجموعہ ''فیہ مافیہ'' ۱۹۱۳ء میں پہلی بار تہران سے شائع ہوا مگر ہمارے ہاں یہ غیر معروف ہی رہا تا آنکہ اس کا متن مولانا عبدالماجد دریا آبادی نے ۱۹۲۸ء میں دارالمصنفین اعظم گڑھ کے زیر اہتمام شائع کروایا۔ متن شائع کرنے میں علامہ اقبال کا مشورہ اور اصرار شامل رہا مگر اس کا امکان بہت کم ہے کہ مثنوی اسرار خودی کی اشاعت اول (۱۹۱۵) کے دور میں اقبال نے فیہ مافیہ کو پڑھا ہو۔ وہ پڑھتے تو رومی کی اصطلاح کا برملا دفاع کرتے اور اس عبارت کو اپنی مثنوی کی اسی طرح زینت بناتے جیسے انہوں نے مثنوی رموز بے خودی کے آغاز میں شعر رومی درج کر کے کیا ہے۔ اس مثنوی کے اردو دیباچے میں اقبال نے محسن تاثیر تبریزی سے استناد کیا ہے۔

اقبال نے حقیقت دعا پر ''خطبات'' میں مفصل لکھا اور دیگر منظوم و منثور تصانیف میں بھی۔ زبور عجم کی غزلیات اس ضمن میں ممتاز ہیں۔ پہلے حصے کی ۵۶ غزلیں یا قطعے خدا کے ساتھ تخاطب کے مظہر ہیں۔ دوسرے حصے کی ۷۶ غزلیں۔ قطعے اگرچہ ابنائے نوع سے متعلق ہیں مگر ان میں خدا انسان کا رابطہ بیان ہوا اور محب اور محبوب کی دعا اور اجابت دعا کئی مناسبتوں سے مذکور ہوئی ہے۔ مثلاً زبور عجم حصہ دوم کے قطعہ ۶۹ کو پڑھیں اور سر دھنتے ہوئے اس گفتار کا اختتامیہ جانیں۔

ما از خدائے گم شدہ ایم از بجستجوست — چون ما نیاز مند و گرفتار آرزوست
گاہے بہ برگ لالہ نویسد پیام خویش — گاہے درون سینۂ مرغاں بہ ہاو ہوست
در نرگس آرمید کہ بیند جمال ما — چنداں کرشمہ دان کہ نگاہش بہ گفتگوست
آہے سحر گہے کہ زند در فراق ما — بیرون و اندرون، زبر و زیر و چار سوست
ہنگامہ بست از پئے دیدار خاکئے — نظارہ را بہانہ تماشائے رنگ و بوست
پنہاں بہ ذرہ ذرہ و نا آشنا ہنوز — پیدا چو ماہتاب و باغوش کاخ و کوست

☆☆☆

صابر آفاقی

ڈاکٹر ایساندرو بوسانی (۱۹۸۸ء۔۱۹۲۱ء)

(ایک عظیم اقبال شناس مستشرق)

پروفیسر ڈاکٹر ایساندر بوسانی عہد حاضر کا شاید سب سے بڑا مستشرق تھا۔ جس نے مغرب کو اسلامی علوم وفنون، فکر وفلسفہ اور شعر وہنر سے آشنا کیا۔ وہ ایک ایسا عبقری تھا جو بتیس زبانوں پر کامل عبور رکھتا تھا۔ بوسانی پہلا خادر شناس ہے جس نے اطالوی زبان میں قرآن حکیم کا ترجمہ کیا۔ وہ پہلا مستشرق ہے جس نے کلام اقبال کا ترجمہ کیا۔ وہ مولانا رومی اور علامہ اقبال کا سچا پرستار تھا۔ اسلامی علوم، اقبال، اردو اور پاکستان پر بوسانی کے احسانات بہت ہیں۔ مشرق ومغرب کے درمیان ان کی حیثیت ایک پل کی تھی۔ علم وادب اور تحقیق وجستجو کی دنیا میں وہ دوسرے مارکو پولو تھے۔

یہ نابغہ روزگار ۱۹۲۱ء میں اٹلی کے ایک کیتھولک گھرانے میں پیدا ہوا۔ اعلیٰ تعلیم روم یونیورسٹی میں پائی۔ ڈاکٹریٹ کی ڈگری ۱۹۴۳ء میں حاصل کی۔ اس وقت بوسانی کی عمر صرف بائیس سال تھی۔

بوسانی دوسری عالمگیر جنگ کے دوران فوج میں چلا گیا جہاں اس کی ملاقات اردو بولنے والے فوجیوں سے ہوئی۔ انہوں نے فوجیوں سے پہلی بار اردو میں یہ جملہ سنا ''بھائی صاحب اچھے ہیں''؟ بوسانی نے پہلے اردو کے ہندسے سیکھے کیوں کہ اسے ان کا صوتی آہنگ عجیب لگا تھا۔ مثلاً اکاون باون، پچپن چھپن وغیرہ، آپ نے فوجی بیرکوں میں ہی سنسکرت زبان کی گرائمر سیکھی تھی۔ آپ نے اردو پروفیسر اجیت سنگھ سے بھی سیکھی تھی جو اٹلی میں اردو کے پروفیسر رہے ہیں۔

بوسانی نے ۱۹۵۵ء میں ناپل یونیورسٹی میں صدر شعبہ اردو کی حیثیت سے کام کرنا شروع کیا اور ۱۹۶۴ء تک خدمات انجام دیتے رہے۔ بعد میں شعبہ فارسی قائم ہوا تو آپ ہی اس کے سربراہ بنے اور اس کے بعد آپ روم یونیورسٹی میں اسلامک اسٹڈیز ڈپارٹمنٹ کے چیرمین رہے۔

کچھ عرصہ کے لئے آپ شعبہ اردو ہندی اور انڈونیشین مالے شعبہ کے چیرمین رہے۔

بوسانی مولانا رومی کے عاشق اور ان کو دنیا کے چار بڑے شعراء ہومر، دانتے شیکسپیر اور گوئٹے کی صف میں شمار کرتے تھے۔ انہوں نے متعدد شعبوں میں تحقیق کی اور درجہ اجتہاد پایا۔ تاریخ ادیان، ادبیات، فلسفہ، تصوف شاعری ان کے پسندیدہ موضوعات تھے۔ وہ جدید وقدیم تمدنوں کے عروج وزوال کے بارے میں خوب جانتے تھے عمر کے آخری سالوں میں ریاضیات اور نجوم کا مطالعہ کیا۔

اب آیئے یہ دیکھیں کہ یہ عظیم المرتبت مستشرق مشرقی زبانوں اور اسلامی علوم کی طرف کیوں کر راغب ہوا؟

بوسانی نے اردو سیکھی تو وہ اس کے ذریعہ عربی کی طرف راغب ہوئے۔ فارسی میں انہوں نے اس قدر مہارت حاصل کر لی تھی کہ فارسی شناس علماء میں چوٹی کے عالم شمار ہونے لگے۔ ان کو کلاسیکی فارسی کے متون نظم نثر پر بے پناہ عبور حاصل تھا۔ وہ جدید فارسی خوب جانتے تھے اور فرفر بولتے تھے۔ علاوہ ازیں وہ اردو، عربی، تامل عبرانی، سنسکرت، مالے، ہندی وغیرہ زبانیں اہل زبان کی طرح لکھتے اور بولتے تھے۔

ڈاکٹر بوسانی کے رفیق کار پروفیسر حشمت موید لکھتے ہیں کہ یورپ کے اسلام شناس اور عرب دان مستشرقین ایک خاص کانفرنس ہر دو سال کے بعد کسی ایک اسلامی ملک میں منعقد کرتے تھے۔ بوسانی جس ملک میں جو لیکچر دیتے وہ اسی ملک کی زبان میں ہوتا تھا۔ حشمت موید لکھتے ہیں کہ از راہ مذاق میں کہتا کہ آپ حضرت سلیمان ہیں جو ہر طرح کے پرندوں کی بولیاں جانتے ہیں۔

ڈاکٹر بوسانی کی زبان دانی اور تبحر علمی کا اندازہ لگانے کے لئے مندرجہ ذیل دو واقعات قابل ذکر ہیں۔ مرحوم کے دوست اور ہم پیشہ استاد جناب ڈاکٹر حشمت موید لکھتے ہیں۔

ایک دفعہ جرمنی کا ایک پروفیسر ناپل یونیورسٹی میں آیا ہوا تھا۔ اس کے لیکچر کا عنوان تھا۔ ''جغرافیہ کے بارے میں قرون اولیٰ کے مسلمان کا علم'' لیکچر اختتام کو پہنچا تو حاضرین میں سے چند آدمیوں نے سوالات کئے مگر یہ جرمن پروفیسر کچھ جواب نہ دے سکا۔ تب ڈاکٹر بوسانی پروفیسر

مذکور سے اجازت لے کر مائیک پر آئے اور تمام سوالوں کے کافی اور شافی جواب دے کر سب کو مطمئن کر دیا۔

دوسرا واقعہ اس طرح ہے کہ عام دوستوں کو یہ علم نہ تھا۔ کہ بوسانی ترکی جانتے ہیں۔ ایک دفعہ روم میں اقبال کے یوم پیدائش پر جلسہ ہوا، بوسانی نے خطاب کیا۔ جلسہ ختم ہوا تو ترکی کا قونصل نزدیک آیا اور انگریزی میں احوال پرسی کرنے لگا مگر بوسانی نے ترکی میں اتنی عمدہ گفتگو کی سب کو محو حیرت کر دیا۔ تیسرا واقعہ جو ایک دوست نے راقم کو سنایا یہ ہے کہ آپ یوروشلم یونیورسٹی میں لیکچر دینے کے لئے تشریف لے گئے۔ آپ نے عبرانی میں اتنا عمدہ خطاب فرمایا کہ بہت سے یہودی اسکالر آپ کو خاخام سمجھنے لگے۔

بوسانی کی نظر میں زبان کی تحصیل مقصود بالذات نہ تھی، بوسانی اسے مختلف تمدنوں تک رسائی کا ذریعہ جانتے تھے۔ فارسی اس لئے سیکھی کہ وہ مسلک، عرفان اور مباحث دینی سے آشنا ہو سکیں۔ چنانچہ وہ فارسی سیکھ کر ایرانی شعراء مثلاً نظامی وغیرہ کے فریفتہ ہو گئے۔ انہوں نے اسکندر نامہ اور ہفت پیکر کا اطالوی میں ترجمہ کیا۔ علاوہ ازیں آپ نے رباعیات خیام کو اطالوی جامہ پہنایا۔ بوسانی بنیادی طور پر فلسفی تھے۔ لامحالہ وہ ایسے لوگوں کے شیفہ تھے جنہوں نے فلسفیانہ افکار کو فروغ دیا تھا۔ بوسانی آدمی کو حوادث زمانہ اور لذات ظاہری سے ماوراء جانتے تھے۔ اسی سبب بوسانی علامہ اقبال کے گرویدہ ہوئے۔ ڈاکٹر حشمت موید فرماتے ہیں بوسانی مغرب کا سب سے بڑا اقبال شناس تھا۔ اور مغربی دنیا میں اقبال کا اولین تعارف کنندہ بھی۔ اس سے پہلے نیکلسن اور چند دیگر لوگ اقبال پر لکھ چکے تھے۔ مگر اقبال کا بہترین کلام ابھی تک ترجمہ نہ ہوا تھا۔ یہ قرعہ فال بوسانی کے کے نام نکلا تھا۔ ۱۹۵۱ میں آپ نے ایک مفصل مقالہ زیر عنوان ''ادبیات ہائے اسلامی' قلم بند کیا جو ۹۵ صفحات پر مشتمل ہے اور کتاب ''اسلام شناسی'' میں درج ہوا ہے ۱۹۵۲ء میں ڈاکٹر بوسانی نے ہسپانیہ کے پروفیسر پارے جا اور جرمنی کے پروفیسر ہرٹلنگ کے تعاون سے ''اردو کی مختصر تاریخ'' مرتب کی جو روم سے شائع ہوئی۔ اس میں اردو کی چند نظموں کے تراجم شامل ہیں اسی زمانہ میں بوسانی نے بانگ دراء، بال جبرئیل'' ضرب کلیم، زبور عجم اور ارمغان حجاز سے انتخاب کر کے اطالوی ترجمہ شائع کیا۔

۱۹۵۵ء میں ''اقبال کی فلسفیانہ شاعری میں ابلیس'' اور انجمن ترقی اردو کراچی کی تاریخ اور کارگذاری اطالوی زبان میں شائع کی۔

۱۹۸۵ء میں مرزا غالب کے فن پر ۲۸ صفحات کا مقالہ جرمن مجلّہ Der Islam کے شمارہ ۳۴ میں شائع کروایا جو بے حد مقبول ہوا۔

ڈاکٹر بوسانی زندہ دل اور بذلہ سنج بزرگ تھے۔ طنز و مزاح کے خاص طور پر دلدادہ تھے۔ عبید زاکانی کا ''ریش نامہ'' انہوں نے شائع کیا۔ اس کتاب کی تعارفی تقریب ہوئی تو بوسانی کی تجویز ایسے لوگوں کو مدعو کیا گیا جن کے نام میں ریش کا لفظ آتا تھا۔ مثلاً سرخ ریش کوتاہ ریش سفید ریش سیاہ ریش وغیرہ، آپ مزاحیہ اور عوام شاعری کو بے حد پسند کرتے تھے۔ ڈاکٹر ابو اللیث صدیقی کی تالیف ''نظیر اکبر آبادی'' کا انہوں نے اطالوی زبان میں ترجمہ کیا۔ جو وہاں سے شائع ہو چکا ہے۔

بوسانی نے ''جاوید نامہ'' کا ۱۹۵۵ء میں اطالوی نظم میں ترجمہ کیا اور اس پر توضیحات وحواشی لکھے۔ اس کے بعد جاوید نامہ کا رآبری نے انگریزی میں اور این میری شمل نے ترکی اور جرمنی زبانوں میں ترجمہ کیا۔ بوسانی نے ۱۹۵۶ء میں گلشن راز جدید'' کا اطالوی ترجمہ کیا جو ناپل یونیورسٹی کے شعبہ مشرق شناسی کے میگزین میں چھپا۔ ۱۹۵۸ء میں بوسانی نے ''تاریخ ادبیات پاکستان'' جیسی اہم تحقیقی اور جامع تالیف شائع کی۔ اس میں اردو'' پنجاب'' سندھی، بلوچی، پشتو اور بنگالی زبانوں کی تاریخ اور ادب کا تعارف کرایا گیا ہے۔

۱۹۵۵ء سے لے کر ۱۹۸۰ء تک بوسانی اقبال پر مسلسل لکھتا رہا۔ اس نے سینکڑوں مقالات لکھے جن میں چند ایک کا ترجمہ انگریزی میں کیا گیا۔ مثال کے طور پر آپ کا مبسوط اور مدلل مقالہ ''فلسفہ و شعر اقبال میں شیطان کا تصور'' قابل ذکر ہے جس کا انگریزی ترجمہ آر اے بٹلر نے کیا جو اقبال ریویو اکتوبر ۱۹۶۰ء میں شائع ہوا۔ آر اے بتلر اس زمانے میں پنجاب یونیورسٹی میں اطالوی زبان کے استاد تھے۔ علاوہ ازیں آپ نے سینکڑوں کانفرنسوں سمیناروں اور یورنیورسٹیوں میں اقبال کی شاعری شخصیت اور فکر و فلسفہ پر لیکچرز دیئے۔

بوسانی پہلے مستشرق ہیں جنہوں نے قرآن حکیم کا ترجمہ اطالوی زبان میں کیا جو ۱۹۵۵ء

میں اور دوسری بار ۱۹۷۸ء میں روم میں شائع ہوا۔ ترجمہ کے ساتھ آپ کا عالمانہ مقدمہ بھی شامل ہے۔ ۱۹۵۸ء میں کتاب ''تمدن ہائے شرق'' میں اسلام کے بارے میں ایک باب کا اضافہ کیا۔ بوسانی نے ۱۹۶۰ء میں ''تاریخ ادبیات فارسی'' لکھی جو ۹۱۶ صفحات پر پھیلی ہوئی ہے۔ اس تالیف میں براؤن اور ریپکا کے برعکس بوسانی نے نمونے نہیں دیئے بلکہ اصناف سخن کا ترجمہ اور تجزیہ پیش کیا ہے۔ ڈاکٹر بوسانی نے ۱۹۷۱ء میں ایک مقالہ ''غیر عرب اسلام'' اور ایک مقالہ ''جدید فرقے جو اسلام سے نکلے'' قلم بند کیا۔

اسلام اور اقبال کے ساتھ ساتھ بوسانی اٹلی میں پاکستان کے بہترین دوست اور تعارف کنندہ تھے۔ آپ ۱۹۶۰ء میں پاکستان آئے اور اسلامی کلوکیم لاہور میں شرکت کی۔ آپ نے اس کلوکیم میں اردو میں تقریر کی جب کہ خود پاکستانی اسکالر انگریزی میں بولتے رہے۔ اس موقع پر آپ نے پشاور اور کراچی کا سفر بھی کیا۔ اس سفر کے دوران آپ نے ایک دوست کی بیاض میں نظامی کا شعر درج کیا اور دستخط اس طرح کئے۔ اسکندر بھوسانی

دوسری مرتبہ پروفیسر بوسانی ۱۹۶۸ء میں پاکستان تشریف لائے۔ اس موقع پر ایک ممتاز صحافی نے ان کا جو انٹرویو لیا اس کے اقتباسات قابل استفادہ ہیں۔

''.....سوادرومۃ الکبریٰ میں بیٹھ کر وہ مشرق کا خواب دیکھتے ہیں اور عالم خیال میں ان افسانوی لوگوں سے ان کی اپنی زبان میں باتیں کرتے ہیں۔ جو سویز کے مشرق میں ابھرتے سورج کی سرزمین تک پھیلی ہوئی الف لیلوی دنیاؤں میں آباد ہیں۔ مشرق کے فسوں نے انہیں بچپن ہی میں اپنا دیوانہ بنالیا۔ تب وہ اس دنیا کے مہم جو لوگوں کی کہانیاں پڑھا کرتے تھے۔ اور آج وہ ان کے شاعروں اور الہامی کتابوں کو پڑھتے .....اور ان کے تراجم کرتے ہیں۔ نظامی گنجوی کے سکندر نامہ سے لے کر قرآن کریم تک وہ اطالوی زبان میں منتقل کر چکے ہیں۔ عربی و فارسی سے لے کر اردو و ملائی تک لکھتے اور باتیں کرتے ہیں۔۔۔ کوئی دس برس پہلے جب میں نے انہیں لاہور میں دیکھا تو ان کے بال سیاہ تھے۔ اب کے جب انہوں نے مشرق کی طرف سفر کیا تو ان کی داڑھی کے بال سفید ہو چکے تھے۔ مشرقی دانش کے علمی خزانوں کی پیہم خوشہ چینی نے ان کے بال اتنی جلدی سفید کر دیئے حالانکہ ان کی عمر صرف ۴۷ برس ہے۔ روم کا یہ نرم مزاج اور دھیمے لہجے میں باتیں کرنے والا محقق مسلمانوں کے علوم وفنون اور

زبانوں سے عشق کرتا ہے۔

پروفیسر بوسانی نوعمری ہی میں جنگ کے دوران فوج میں چلے گئے جہاں ان کی ملاقات ہندوستان کے فوجیوں سے ہوئی۔ انہوں نے فوجیوں سے پہلی بار اردو میں یہ جملہ سنا، ''بھائی صاحب مزاج اچھے ہیں۔'' سب سے پہلے اردو کے ہندسے سیکھے کہ انہیں ان کا صوتی آہنگ عجیب سا لگا مثلاً پچپن چھپن، اکان باون وغیرہ۔۔ انہوں نے عمر خیام کی رباعیات بھی اطالوی میں منتقل کیں۔ اب کے جب وہ لاہور آئے تو میں نے پوچھا'' آپ کیسے تشریف لائے ہیں''۔ بڑی سادگی سے کہنے لگے'' تامل زبان کے بارے میں مدراس میں ایک بین الاقوامی کانفرنس تھی۔ میں نے وہاں'' تامل میں فارسی'' زبان کے الفاظ کے موضوع پر ایک مقالہ پڑھا ہے''۔ جب مذہب پر گفتگو ہوئی تو انہوں نے کہا۔'' میرا اپنا مذہب تو بہائی ہے۔'' کہ میرے خیال میں یہ مذہب تمام مذاہب کی اچھائیوں کا مجموعہ ہے لیکن اسلامی علوم سے دلچسپی نے مجھے اسلام سے بہت قریب کر دیا ہے۔ انہوں نے قرآن پاک کا اطالوی رواں اور سلیس ترجمہ کیا ہے جس میں اس فصاحت و بلاغت کو قائم رکھنے کی کوشش کی گئی ہے جو قرآن کا اعجاز کہلاتی ہے۔

پروفیسر بوسانی نے ۱۹۷۹ء میں اٹلی کے جدید دائرۃ المعارف کے لئے ایک مقالہ ''اسلام'' کے عنوان سے تحریر کیا جو چالیس صفحات پر مشتمل ہے۔

جیسا کہ پہلے ذکر ہوا، بوسانی نے فارسی اور عربی کے توسط سے تمدن اسلامی کا مطالعہ شروع کیا اس کے بعد وہ ہر دو سال میں ایک مشرقی زبان سیکھ لیتے تھے اردو کے ذریعے وہ برصغیر کے علماء و شعراء کے افکار سے آشنا ہوئے۔ اقبال کے علاوہ آپ نے جن شعراء و عرفاء پر تحقیقی مقالات تحریر کئے ہیں ان کی فہرست اس طرح ہے۔ حافظ، غالب، بیدل، خیام، سنائی، عطار، نظامی، ابن سینا، الطاف حسین حالی، شہاب الدین سہروردی، عبید زاکانی، ابوریحان البیرونی، ابن رشد، قطب الدین شیرازی، ابن عربی، اخوان الصفا، شاہ ولی اللہ دہلوی۔

حروفیہ، انواع وحدت وجود، اساطیر و شعر میں زمان، شہرستانی و مزدک دین دور مغول میں اسلام میں نماز و دعا، مزدیسنی اور آئین قدیم، ہند میں اسلام کے مشخصات۔ مسیحیت و اسلام میں مشترک و متضاد رابطے، اسلام تمدن عرب کا ایک اہم جزو، مارکو پولو اور اسلام، فلسفہ ابوریحان میں تثلیث مسیحی،

تمدن غرب میں اسلامی قدریں، یورپ میں مخاصمت اسلام کی تاریخ، اسلام میں تربیت، قدیم ایرانیوں کے عقائد وغیرہ۔

برصغیر کی زبانوں کے بعد آپ کی توجہ ملائیشیا اور انڈونیشیا کی زبانوں کی طرف ہوئی پھر جلد ہی مالے زبان کے استاد بن گئے۔ پھر چینی زبان سیکھی، چینی میں ان کا وہ مقالہ بہت مقبول ہوا جس میں آپ نے چینی اشعار میں فارسی غزل کی مشابہت دکھائی۔

قدرت نے بوسانی کو عجیب وغریب اذواق کا مجموعہ بنایا تھا۔ مندرجہ ذیل تالیفات مرحوم بوسانی کی جامع الاذواق شخصیت کو ثابت کرنے کے لئے کافی ہیں۔ اشعار وحکایات ملائیشیا، کتاب بودا، تاریخ ادیان جنوب مشرقی ایشیاء، آثار ادبی برما، سیام، لاؤس، کمپوچیا، ویٹنام، انڈونیشیاء فلسطین یہ کتاب ۴۴۲ صفحات پر محیط ہے۔

۱۹۸۰ء میں آپ نے ایک اور کتاب تصنیف کی جس کا نام ''اسلام'' ہے اور یہ ۲۳۲ صفحوں پر محیط ہے۔ بوسانی کی ایک اہم تصنیف ''دین ایران از زرتشت تا بہا اللہ'' ہے جس کے کل صفحات ۵۴۲ ہیں اور ۱۹۵۹ء میں طبع ہوئی۔

اسلام اور دیگر ادیان کے ساتھ ساتھ بوسانی نے بہائیت پر بہت مفید مواد فراہم کیا ہے۔

انہوں نے ۱۹۴۹ء میں مشہور شاعرہ قرۃ العین طاہرہ کی ایک غزل کا اطالوی میں ترجمہ کیا۔

ممتاز پاکستانی اسکالر جناب پروفیسر اقتداء حسن نے ڈاکٹر بوسانی کا خاکہ ان الفاظ میں تحریر کیا ہے۔

''چھ فٹ سے نکلتا ہوا قد، متناسب ڈیل ڈول، کشادہ پیشانی، خوبصورت داڑھی، قد کاٹھ سے روسی اور چہرے مہرے سے عبرانی لگتے تھے۔ ان میں نہ روایتی پروفیسر کا طمطراق تھا نہ کروفر، اور نہ تنک مزاجی تھی۔ انہوں نے جتنا کام کیا وہ اگلے وقتوں کے علماء کی یاد تازہ کرنے کے لئے کافی ہے''۔

بوسانی متواضع شخص تھے۔ سادہ و بے ریا تھے۔ کسی کی بدگوئی نہ کرتے تھے۔ دفتر سازشوں سے لاتعلق تھے۔ عیب جو اور تنگ نظر نہ تھے اور نہ متعصب تھے، آزادی خیال کو ہر کسی کا حق سمجھتے تھے۔ وہ صحیح معنوں میں ایک درویش آدمی تھے۔ جاہ ومنصب کی کبھی خواہش نہیں کی۔ نہ ہی بے جا شہرت کی تمنا رکھتے تھے ۲۸ سال تک اٹلی کی نابل اور روم یونیورسٹی میں استاد رہے۔ آج اٹلی کے اکثر اسلام شناس اور فارسی دان اساتذہ اسی استاد کی شاگردی پر فخر کرتے ہیں۔ انہوں نے ساٹھویں سالگرہ کی مناسبت

سے ایک کتاب بنام ''غالیچہ شیخ'' مرتب کی اور اپنے قابل فخر استاد کے حضور پیش کی تھی۔

بوسانی دنیا کی متعدد علمی سوسائٹیوں کے رکن تھے۔ وہ اٹلی کی سب سے بڑی اکاڈمی منچی کے ممبر تھے اور انہوں نے کئی تمغے اور اسناد حاصل کیں۔ حکومت پاکستان نے ڈاکٹر بوسانی کو ستارۂ امتیاز اور ہلال امتیاز سے نوازا تھا۔ آخری مرتبہ آپ بین الاقوامی علامہ اقبال کانگریس میں شرکت کرنے کے لئے دسمبر ۱۹۷۷ء میں پاکستان تشریف لائے تھے۔

۷۲۔۱۹۶۸ء کے عرصہ میں راقم کا قیام تہران میں تھا۔ مرحوم بوسانی سے میں نے خط وکتابت کا آغاز وہیں کیا تھا۔ لیکن ملاقات کا شرف ابھی تک حاصل نہ ہوا تھا۔ خوش قسمتی سے میں بھی اقبال کانگریس میں مدعو تھا۔ میں جب یکم دسمبر کی دوپہر کو لاہور کے انٹر کانٹی نینٹل ہوٹل کی لابی میں پہنچا تو میری آنکھیں بے تابی سے بوسانی کو تلاش کرنے لگیں۔ میں نے دیکھا کہ ڈاکٹر بوسانی کرسی پر بیٹھے ہوئے ہیں اور ملائشیا کے ڈاکٹر العطاس سے مصروف گفتگو ہیں۔ میں نے سلام عرض کیا اور تعارف کروایا تو بڑی محبت سے ملے اور پھر اپنی مصری نژاد بیگم ایلسا سے میرا تعارف کروایا۔ اس کے بعد کانگریس کے دوران ہر روز ہی ملاقاتیں ہوتی رہیں۔

کانگریس کے دوران میں نے دیکھا کہ ڈاکٹر صاحب چونکہ علم وفضل کے ساتھ ساتھ عمر کے لحاظ سے بھی دیگر مستشرقین سے بڑے تھے۔ اس لئے وہ ہر جگہ چھائے رہے۔

سبھی لوگ آپ کی بے حد عزت کرتے اور آپ سے استفادہ کرتے۔ کانگریس کے دوران لاہور کے علمی وادبی حلقوں نے آپ سے بھرپور استفادہ کیا۔

''نقوش'' کی تقریب ہو یا آذر زوبی کے فن پاروں کی نمائش آپ ہر جگہ مدعو کئے گئے۔ گورنر ہاؤس میں مرحوم صدر ضیاء الحق نے شرکاء کانگریس کو عصرانہ دیا تو ڈاکٹر بوسانی کو مرحوم صدر نے خصوصی طور پر اپنے پاس بلایا اور ساتھ والی کرسی پر بیٹھنے کی درخواست کی۔

۱۹۷۷ء سے ۱۹۸۸ء تک تقریباً بارہ سال کا عرصہ بنتا ہے۔ اس دوران انہوں نے مزید تحقیقی میدان مارے اور علمی مسافتیں بھی طئے کرتے رہے۔

افسوس کہ ۱۹۸۷ء میں ڈاکٹر بوسانی پر فالج کا شدید حملہ ہوا۔ ان کی بیگم ایلسا صاحبہ نے ۲۳ ستمبر ۱۹۸۷ء کو اس خاکسار کے خط کے جواب میں لکھا ''بوسانی فالج کے مریض ہیں۔ بات چیت نہیں کر سکتے۔ لیکن صاف ذہن رکھتے ہیں۔ اپنی شوخی وظرافت کو ہاتھ سے جانے نہیں دیا، ہم

دونوں کو آپ کی وہ ملاقات یاد ہے جو ہم نے لاہور کانگریس میں کی تھی۔''

۲۸ مارچ ۱۹۸۸ء کے اخبارات میں ڈاکٹر ایساندرد بوسانی کی وفات کی خبر پڑھی تو مجھے اچانک عربی کا شعر یاد آ گیا۔

ماکنت احسب قبل دفنک فی الثری
ان الکواکب فی التراب نغور

درحقیقت ڈاکٹر بوسانی ۱۳ مارچ ۱۹۸۸ء کو فوت ہوئے تھے اور ان کو ۱۵ مارچ ساڑھے نو بجے صبح روم میں دفنایا گیا۔ ان کی عمر ۶۸ سال تھی۔ آپ کے کوئی اولاد نہ تھی۔ وہ اپنی بیوی اور دنیا بھر میں ہزاروں عقیدت مندوں اور شاگردوں کو سوگواری سونپ کر چلے گئے۔

ڈاکٹر بوسانی عالمی شہرت کے حامل خادر شناس اور اسلام دوست محقق تھے۔ دنیا بھر کے اخبارات نے تعزیتی مضامین چھاپے۔ نشرگاہوں نے اس نقصان پر حکومتوں، حکمرانوں اور اسکالروں کے بیانات نشر کئے۔ علمی اور تعلیمی اداروں نے قرارداد تعزیت پاس کیں۔

مرحوم صدر ضیاء الحق نے ڈاکٹر بوسانی کی وفات پر ان کی بیگم کے نام جو تعزیتی پیغام بھیجا اس میں کہا گیا تھا۔

''اپنے قابل احترام شوہر کی وفات پر ہماری طرف سے دلی تعزیت قبول کریں۔ پروفیسر بوسانی ایک ممتاز اسکالر تھے۔ جنہوں نے اپنی ادبی تصانیف کی وجہ سے بین الاقوامی شہرت پائی۔ انہوں نے اطالوی میں جو قرآن پاک کا اور فلسفی شاعر علامہ اقبال کی تصنیف ترجمہ کیا اس کی وجہ سے وہ پاکستان میں ایک مخصوص مرتبہ رکھتے ہیں۔ اٹلی اور پاکستان کی ثقافتوں کے فروغ کے لئے انہوں نے جو گراں قدر خدمات انجام دی ہیں ان کے سبب مرحوم کو ہلال پاکستان کا ایوارڈ دیا گیا تھا۔ وہ ہمارے ملک میں ایک ممتاز اہل قلم اور پاکستان کے مخلص دوست کے طور پر ہمیشہ یاد رکھے جائیں گے۔ اللہ تعالیٰ آپ کو یہ ناقابل تلافی نقصان برداشت کرنے کی ہمت دے اور مرحوم کو آرام وراحت کا مقام عنایت فرمائے۔'' اسی طرح کا ایک تعزیتی پیغام اس وقت کے وزیراعظم جناب محمد خان جونیجو نے بھی بھیجا تھا۔

افسوس کہ پاکستانی اسکالرز اور خاص طور پر برصغیر کا اردو دان طبقہ ڈاکٹر بوسانی کی

تحقیقات سے آشنا نہیں ہے۔ اگر آپ کی تالیفات اور مقالات کا اردو یا انگریزی میں ترجمہ ہو جائے تو پتہ چلے کہ کتنے عظیم مستشرق سے محروم ہو گئے ہیں۔ پروفیسر اقتدا حسن کے بقول ''ہماری نئی نسل جس میں نوجوان صحافی بھی شامل ہیں۔ اس عظیم اطالوی اور شاید دور حاضر کے سب سے بڑے مستشرق کے صحیح مقام سے واقف نہیں''۔

گمان ہوتا ہے ڈاکٹر بوسانی کی وفات پر حضرت مولانا جلال الدین رومی نے فرمایا تھا۔

جنازہ ام چو ببینی مگو فراق فراق
مگر وصال و ملاقات آں زماں باشد
مرا بہ گور سپر دی مگو وداع وداع
کہ گور پردۂ جمعیت جناں باشد
فرو شدن چو بدیدی برآمدن بنگر
غروب شمس وقمر را چرا زیا باشد

☆☆☆

اپنی جولاں گاہ زیر آسماں سمجھا تھا میں
آب و گِل کے کھیل کو اپنا جہاں سمجھا تھا میں
بے حجابی سے تری ٹوٹا نگاہوں کا طلسم
اک ردائے نیلگوں کو آسماں سمجھا تھا میں
کارواں تھک کر فضا کے پیچ و خم میں رہ گیا
مہر و ماہ و مشتری کو ہم عناں سمجھا تھا میں

قاضی عبدالغفار

پیامِ اقبالؔ

اے زمین کے سورما بیٹے
اُسے نئی شان سے تعمیر کر!
اپنے سینہ میں اپنے دل میں
اس کی پھر سے بنیاد رکھ
زندگی کا ایک نیا دور
روشن ضمیری سے شروع ہو
اور اس کی تہنیت میں
نئے گیت گائے جائیں
(گوئٹے)

شعر ایک الہام ہے۔ جو الہام نہیں وہ شعر نہیں، محض نظم ہے قافیہ، ردیف، لے اور ترنم کی ایک ترکیب، استعداد فطرت کے مصفّٰی چشموں سے جس سمندر کی گہرائی لبریز ہوتی ہے وہ سمندر شاعر ہے! وہ مفسر فطرت ہے۔ وہ مصور فطرت ہے، وہ مدبر فطرت ہے، نبی اور پیغمبر کے بعد فطرت الٰہی کا وہی ایک ترجمان ہے۔

اقبال کی شاعری کے متعلق کہنے کو لوگوں نے کیا کیا نہ کہا۔ اور کیا کیا نہ کہیں گے۔ مگر مجھے اقبال کے سرودِ مستانہ کے جس تار کی آواز سب سے زیادہ بھلی معلوم ہوتی ہے اس کا کچھ حال مجھ سے سن لیجئے اقبال کی شاعری تغزل بھی ہے۔ ترنم بھی ہے شوکت الفاظ بھی رکھتی ہے۔ اس کی بندشیں بھی چست ہیں، خیالات کی بلندی اور گہرائی بھی اس کے دامن سے وابستہ ہے اس میں داغ کی زبان بھی ہے غالب کا فلسفہ بھی ہے، شبلی و حالی کی قومیات بھی ہیں۔ سب کچھ ہے جو ہونا

چاہیے۔ مگر اس سب کچھ کے اندر جو ایک پیام عمل ہے جو فلسفۂ حرکت وحیات ہے جو دعوت ہے وہی اس سب کچھ کی جان ہے ملت کے وجود اجتماعی میں شاعر کا وجود سرتا پا پیامِ عمل نہ ہو تو کچھ بھی نہیں اس کا وجود ہی بیکار ہو جاتا ہے۔ وہ قوالی کی محفلوں کی زینت اور کتب خانوں کی آرائش ہو سکتا ہے مگر اور کچھ نہیں ہو سکتا۔

اقبال کی شاعری کا ہر دور ایک ہی فلسفۂ حیات کا حامل ہے۔ ابتدائی دور میں خیالات کی جدت و وسعت تو تھی مگر گہرائی بہت کم تھی۔ دوسرے دور میں شاعر کا شعر اپنے لئے ایک وسیع میدان مانگنے لگا۔ اس کے افکار عالیہ اردو ادب کی زنجیروں کو توڑ کر ہوا میں بلند ہونے لگے۔ اقبال کے بیتاب جلوؤں پر اردو کا لباس تنگ ہو چلا تھا۔ جو پہاڑی چشمہ وادیوں اور کہساروں میں بہ رہا تھا۔ وسیع اور طویل میدان ڈھونڈ نا ہوا نکلا۔ اسی دور میں اقبال نے ''کنار آب رکنا باد'' کے ترک شیرازی سے کسب سعادت شروع کیا اور چند ہی روز میں شاعر کا شعر فضائے زندگی مین اس طرح پھیلنے لگا جس طرح کہ ہندوستان میں کسی اردو اور فارسی کے استاد کی شاعری کبھی نہ پھیلی تھی۔

اقبال کے سینہ میں دو روحوں کا آشیانہ تھا۔ ایک شاعر کی حسن پرست اور عشق پرور روح اور ایک مسلمان کی ہنگامہ خیز اور شورش انگیز روح۔ آخری دور میں حسن پرست روح ساکن اور مسلمان کی روح اس طرح ہنگامہ آرا ہوگئی کہ شاعر اپنا پیام بن کر ہر طرف چھا گیا۔ اب سننے والے یہ نہیں دیکھتے کہ زبان اردو ہے یا فارسی۔ اقبال کی شاعری نے زبان اور طرز ادا کے امتیازات سے قلع نظر کر لی۔ بس کہے جانا ہے کہے جانا ہے۔ اس نظریہ کی وسعت کو کہ شاعری نوع انسان کی مادری زبان ہے۔ اقبال کی شاعری نے واضح کر دیا اس کے لئے اردو اور فارسی کا امتیاز ایک قصہ پارینہ ہے۔

اقبال کی شاعری یاس اور شک سے پاک ہے وہ نہ خود مایوس ہوتا ہے نہ دوسروں کو مایوس ہونے دیتا ہے۔ وہ مایوس ہونے والوں کو حقارت کی نظر سے دیکھتا ہے اور تنبیہ و توبیخ کے چند لفظ کہہ کر ٹھکراتا ہوا گذر جاتا ہے اس کو اپنے پیام کی قبولیت اور اپنے ایمان کی استواری میں ذرہ برابر شک نہیں ہے جس راستہ پر اس کا تخیل اس کو لئے جاتا ہے اس راستہ کی صحت پر شاعر ایمان کامل رکھتا ہے۔ یاس و شک سے اقبال کے تخیل کی یہ کامل آزادی اقبال کے پیام کو طاقت پرواز

اور اثر بخشتی ہے پھر اگر اس کامل آزادی کا جو زلف ورخ کے استعارات سے اکثر بے نیاز ہو کر اپنے جلوے بے حجاب کر دیتی ہے۔ زمانہ کی سیاسی اصطلاحوں میں ترجمہ کیا جائے۔ اور اقبال جس جرأت رندانہ کے ساتھ مشاہدہ حق کی گفتگو کرتا ہے اس کی تفسیر ادنیٰ سیاسیات کے رنگ میں لکھی جائے تو بہت ممکن ہے کہ اقبال کی ساری شاعری بحق سرکار فرنگ ضبط ہو جائے لیکن شاعر کے پیام کو ادنیٰ سیاسیات کی اصطلاحوں سے آلودہ کرنا ایک شرک جلی ہے۔

یہ بحث بھی فضول ہے کہ اقبال شاعری کے کس ''درس'' سے تعلق رکھتے ہیں میری رائے میں ہندوستان یا ایران کی شاعری کا کوئی۔ درس بھی اقبال کا درس نہیں ہے۔ صہبا وہ خم خانہ قدیم سے لائے۔ صہبا بھی انگوری نہیں بلکہ عرب کی کھجور کا افشردہ، جام و مینا انہوں نے اپنے لئے خود ہی بنایا۔ داغ، وحالی، وشبلی سے الگ انہوں نے اپنی دنیا آباد کی۔ اب نہ داغ ہیں نہ حالی ہیں نہ شبلی۔ اقبال بجائے خود اقبال ہے۔ بیس برس پہلے وہ وقت تھا جب اقبال کا درس قائم نہ ہوا تھا اور وہ ہنوز، امیدواری کے دور سے گذرے تھے۔ جس طرح پیغمبروں کے لئے ایک زمانہ امیدواری کا مقرر ہے کبھی پہاڑوں پر کبھی حجروں اور غاروں میں جب وہ خاموشی کے ساتھ کسب سعادت کرتے ہیں۔ اسی طرح شاعر کو بھی کچھ عرصہ امیدواری کرنی پڑتی ہے پھر جب وہ اپنا پیام تیار کر کے اس اعتکاف سے باہر آتا ہے تو ایک مستحکم ایمان اور غیر متزلزل پیام لے کر آتا ہے۔

اقبال کے ابتدائی دور میں ایک بے چینی، بے اطمینانی اور جھجک تھی

نور کا طالب ہوں گھبراتا ہوں اس بستی میں میں
طفلک سیماب پا ہوں ظلمت ہستی میں میں

☆☆

ہاں آشنائے لب نہ ہو راز کہن کہیں
پھر چھڑ نہ جائے قصہ دار و رسن کہیں

☆☆

اقبال بہ منبر زوزارے کہ نہ باید گفت
ناپختہ بروں آمد از خلوت میخانہ

لیکن چند ہی سال بعد امید واری کا وہ دور ختم ہوا اور اقبال کا وجدان روحانی ان کو قصہ دار و رسن کے جواز میں لے جانے لگا۔ وہی شاعر جو خلوت میخانہ سے ناپختہ آیا تھا۔ اب حیات ہی کے جلوت خانہ میں ایک حقیقت مسلمہ ہے ایک زندہ پیغام عمل ہے اب وہ سخن نگفتۂ را چہ قلندرانہ گفتم کی منزل پر آ گیا دس برس پہلے کے ڈھکے ہوئے اشارے۔ دھیمی آوازیں۔ ایک کھلا پیام بن کر گرجنے لگیں اور شاعر نے اب دنیا کو اپنی طرف یوں بلانا شروع کر دیا۔

مرا بنگر کہ در ہندوستان دیگر نمی بینی
برہمن زادۂ رمز آشنائے روم و تبریز است

☆☆

زشاعر نالۂ مستانہ در محشر چہ میخواہی
تو خود ہنگامۂ ہنگامہ دیگر چہ میخواہی

☆☆

بہ بحر نغمہ کردی آشنا طبع روانم را
زچاک سینہ ام دریا طلب گوہر چہ میخواہی

وہی شاعر جو بقول اقبال ''پریشاں جلوۂ جوں ماہتاب اندر بیابانے'' تھی اب ایک شعلہ بن کر چھا گئی اپنی شاعری اور اپنے پیام کی تشریح یوں فرماتے ہیں

یوسف گم گشتہ را باز کشیدم نقاب
تا بہ تنک مائگاں ذوق خریدن دہم

☆☆

بہ سواد دیدۂ تو نظر آفریدہ ام من بہ ضمیر تو جہانے دگر آفریدہ ام من
ہم خاوران بخوابے کہ نہاں زچشم انجم بہ سرود زندگانی سحر آفریدہ ام من

☆☆

ہویدا آج اپنے زخم پنہاں کر کے چھوڑوں گا
لہو رو رو کے محفل کو گلستاں کر کے چھوڑوں گا

اس عزم مستحکم کے ساتھ، وہ شاعر ازل جو اقبال کے اندر تھا۔ کبوتر کے تن نازک میں شاہین کا جگر پیدا کرنے کا مدعی ہو کر اپنے خلوت خانہ سے باہر آیا

ترے سینہ میں ہے پوشیدہ رازِ زندگی کہدے
مسلماں سے حدیث سوز وساز زندگی کہدے

☆☆

عشق کی آشفتگی نے کردیا صحرا مجھے — مشت خاک ایسی نہاں زیر قبا رکھتا ہوں
جستجو کل کی لئے پھرتی ہے اجزا میں مجھے — حسن بے پایاں ہے دردِ لا دوا رکھتا ہوں میں
فیض ساقی شبنم آسا ظرف دل دریا طلب — تشنۂ دایم ہوں آتش زیر پا رکھتا ہوں میں

وہ دعائیں دیتا ہوا آتا ہے۔ اور اس کی دعائیں بھی اس کے پیام سے لبریز ہوتی ہیں۔

☆☆

نوجواں خام سوزے سخنم تمام سوزے — غزلے کہ می سرایم بتو سازگار بادا
چو بجان من درای دگر آرزو نہ بینی — مگر ایں کہ شبنم نویم بے کنار بادا
نشو و نصیب جائے کہ دلے قرار گیرد — تب وتاب زندگانی بتو آشکار بادا

اقبال جذبات اسلامی سے مست ہے از خود رفتہ ہے اس کی شاعری میں سب کچھ یہی ہے

میرا ساز اگرچہ ستم رسیدہ زخمہائے عجم رہا
وہ شہید ذوق وفا ہوں میں کہ نوا مری عربی رہی

کبھی بارگاہِ رسالت میں طرابلس کے شہیدوں کا لہو لے کر حاضر ہوتا ہے کبھی بیتاب ہو ہو کر دعائیں مانگتا ہے۔

☆☆

یارب دل مسلم کو وہ زندہ تمنا دے — جو قلب کو گرما دے اور روح کو تڑپا دے
پھر وادیٔ فاراں کے ہر ذرہ کو چمکا دے — پھر شوق تماشا دے پھر ذوق تقاضا دے
بھٹکے ہوئے آہو کو پھر سوئے حرم لے چل — اس شہر کے خوگر کو پھر وسعت صحرا دے

کبھی مسافران حجاز کے قافلہ کے ساتھ ساتھ اپنی آبلہ پائی سے ایک پیام عمل دیتا چلا جارہا

ہے

خوف کہتا ہے کہ یثرب کی طرف تنہا نہ چل
شوق کہتا ہے کہ تو مسلم ہے بیباکانہ چل

☆☆

بے زیارت سوئے بیت اللہ پھر جاؤں گا کیا
عاشقوں کو روز محشر منہ نہ دکھلاؤں گا کیا ؟

☆☆

خوف جاں رکھتا نہیں کچھ دشت پیمائی حجاز
ہجرت مدفون یثرب میں یہی مخفی ہے راز

مگر اقبال کا یہ مستانہ جذبہ اسلامی محض جذبہ ہی نہیں ہے اس نے تعلیمات اسلامی کے گہرے مطالعہ کے بعد اپنی زندگی کا ایک فلسفہ وضع کرلیا احساس خودی کا فلسفہ اقبال کا بنیادی فلسفہ ہے۔ اقبال کی نظر میں ملت اور افراد کی زندگی کچھ بھی نہیں۔ اگر وہ اس فلسفہ میں بیگانہ ہے

چون کلیمے شد بروں از خویشتن
دست اُو تاریک وچوب اور سن!

شاید کہا جائے گا کہ یہ ایک عظیم الشان اور اختلافی مسئلہ ہے اور اس لئے یہ اوراق اس بحث کا تحمل نہ کرسکیں گے قطع نظر اس امر کے یہ فلسفۂ خودی ایک اختلافی مسئلہ ہے یا نہیں۔ میں ان اوراق میں اس بحث کو کیوں چھیڑوں کہ ان اوراق کا یہ موضوع ہی نہیں ہے بہر حال اقبال کی شاعری کے دور ثالث کی تمام بنیاد اسی فلسفہ پر ہے جس کے لئے اپنے زور قلم کو وقف کردیا۔ اسی فلسفہ کی فضا میں اقبال کی شاعری نے بلندی پائی، حوصلہ پایا، نظر پائی اور ایمان پایا وہی فلسفہ اقبال کو اس دنیا میں لے گیا۔ جہاں ڈھونڈنے والوں کے لئے حیات ملی اور مسلمانوں کی اجتماعی اور انفرادی زندگی کی ایک نئی جنت کا دروازہ سامنے آتا ہے۔ شراب بلاشبہ پرانی ہے قدیم ہے مگر مینائی ہے۔ اقبال نے اس مینا کو بہت مزین اور منقش کردیا ہے وہ اپنے فلسفہ کی چٹان پر کھڑا ہوکر عصر جدید کو ایک عام چیلنج دیتا ہے۔ اس چیلنج کے ساتھ ساتھ ایک پیام زندگی بھی ہے۔

اقبال ''وطنیت'' اور ملت اسلامی کی جغرافی حد بندی کا دشمن ہے

آں چناں قطع اخوت کردہ اند بروطن تعمیر ملت کردہ اند
تا وطن راشمع محفل ساختند نوع انساں را مقابل ساختند

وہ مغربی باطل پرستوں کے اس تخیل کی اپنے ہر صفحہ پر اور ہر سطر میں تحقیر کرتا ہے جس نے ''وطنیت'' کو دنیا کا معبود بنا کر

طرح تدبیر زبوں فرجام ریخت
یک خسک دربارۂ ایام ریخت

تیرہ سو برس پرانی وطنیت کا تخیل آج بھی اقبال کا تخیل ہے۔

نرالا سارے جہاں سے اس کو عرب کے معمار نے بنایا
بنا ہمارے حصار ملت کی اتحاد وطن نہیں ہے

☆☆

ہو قید مقامی تو نتیجہ ہے تباہی رہ بحر میں آزاد وطن صورت ماہی
ہے ترک وطن سنت محبوبِ الٰہی دے تو بھی نبوت کی صداقت پہ گواہی

☆☆

گفتار سیاست میں وطن اور ہی کچھ ہے
ارشاد نبوت میں وطن اور ہی کچھ ہے

دور حاضرہ کی جدتوں کا اقبال قائل نہیں ہے وہ ابھی تک قدیم تخیل کا دامن مضبوط پکڑے ہوئے ہے

☆☆

اس دور میں مے اور ہے جام اور ہے جم اور ساقی نے بنا کی روش لطف وکرم اور
مسلم نے بھی تعمیر کیا اپنا حرم اور تہذیب کے آذر نے ترشوائے صنم اور

☆☆

ان تازہ خداؤں میں بڑا سب سے وطن ہے
جو پیرہن اس کا ہے وہ مذہب کا کفن ہے

مغرب کے تہذیب وتمدن کو وہ فسونگری خرد سے تعبیر کرتا ہے عقل ودانش کی کارفرمائیوں سے بے نیاز ہوکر وہ ایک جرعۂ ''عرفان'' مانگتا ہے۔ وہ تہذیب علوم جدیدہ سے اس قدر بیزار ہے کہ مصوری اور موسیقی کو بھی ''فنون لطیفہ غلاماں'' کے نام سے یاد کرتا ہے اور شکوہ کرتا ہے کہ ان کے اندر موت ہے زندگی نہیں ہے

می چکد از خامہ ہا مضمون موت
ہر کجا افسانہ وافسون موت

☆☆

بے یقیں را لذت تحقیق نیست
بے یقیں را قوت تحقیق نیست

مغنی اور مصور اس کی نظر میں بازاری مذاق کے غلام ہیں

رہبر اُو ذوق جمہور است وبس

تقلید اقبال کے مذہب میں کفر سے کم نہیں اور ہر مجتہد کے مذہب میں ایسی ہی سمجھی جاتی ہے' تہذیب جدیدہ کی تقلید اس کی نظر میں مرگ ملت ہے

قیمت شمشاد خود نشاختی
سرو دیگر را بلند نداختی

☆☆

مثل نئے خود راز خود کردی تہی
برنوائے دیگراں دل مے نہی

☆☆

اے گدائے ریزہ از خوانِ غیر
جنس خود می جوی از دوکان غیر

☆☆

بزم مسلم از چراغ غیر سوخت
مسجد او از شرار غیر سوخت

☆☆

از سواد کعبہ چوں آہو رمید
ناوک صیاد پہلو لیش درید

اقبال ملت اسلامی کی خرابی کا بڑا سبب اسی تقلید کو سمجھتا ہے اور اسی لئے بار بار فسونگری خرد کی عمارتوں پر تیشہ چلاتا ہے وہ سمجھتا ہے کہ اس خس وخاشاک سے میدان صاف ہو لے تو اس کا پیام سنا جائے جو بھٹکے ہوئے ہیں وہ راستہ پر آئیں اور جو آہو، سواد کعبہ، سے دور چلے گئے ہیں ان کے پہلو ناوکِ صیاد سے محفوظ ہو جائیں۔

☆☆

اے کہ در مدرسہ جوی ادب ودانش وذوق نخر دبا وہ کس از کار گہہ شیشہ گراں
خرد افزو ومرا درس حکیمان فرنگ سینہ افروخت مر اصحبت صاحب نظراں
برکش آں نغمہ کہ سرمایہ آب وگل تست اے زخود رفتہ تہی شوز نوائے دگراں

☆☆

زخاک خویش طلب آتشے کہ پیدا نیست تجلی دگری در خورتما شا نیست
اگر چہ عقل فسوں پیشہ لشکرے انگیخت تو دل گرفتہ ، نہ باشی کہ عشق تنہا نیست

اقبال کی شاعرانہ زندگی کا سب سے بڑا جہاد، عقل فسوں پیشہ، کے خلاف ہے، وہ پہلے مسلمانوں کے دلوں میں یہ احساس خودداری پیدا کرنا چاہتا ہے کہ تجلی دگرے درخور تماشا نیست پھر وہ راستہ بتاتا ہے کہ از خاک خویش طلب آتشے کی پیدا نیست۔ اور طرح طرح سے قدم قدم پر کبھی رنج کے ساتھ کبھی طنز کے انداز میں کبھی استہزا کے لہجہ میں کبھی تحقیر کے پیرایہ میں وہ تہذیب فرنگ کے بتوں کو سرنگوں کو دینا چاہتا ہے۔ اور بار بار اس تہذیب کے دل دادگان کو اپنی طرف بلاتا ہے۔

نرسد فسوں گری خرد تپیدن دل زندۂ
زکنشت فلسفیاں در آبحریم سوز گدازمن

فلسفۂ فرنگ کے بت خانہ کا بڑا عالی حوصلہ اور بلند نظر غزنوی ہے تمدن جدیدہ کے ہر تخیل جو عصر حاضر کے بت خانہ کا بت ہے۔ وہ تحقیر کی انگلی سے اشارے کر کے دکھلاتا اور کہتا ہے۔

☆☆

بتان تازہ ترا شیدہ دریغ از تو درونِ خویش نہ کا دیدۂ دریغ از تو
چناں گداختہ از حرارتِ افرنگ ز چشم خویش ترا دیدۂ دریغ از تو
گرفتم ایں کہ کتاب خرد فرد خواندی حدیث شوق نہ فہمیدۂ دریغ از تو
طواف کعبہ زوی گرد دیر گردیدی نگہ بخویش نہ پیچیدہ دریغ از تو

کتاب خرد اور ''حدیث شوق'' کتاب خرد کی خامیاں اور حدیث شوق کی گرمیاں کس کس انداز سے وہ مغرب پرست مشرق کے سامنے پیش کرتا ہے۔ عشق اور عقل کے اس مجادلہ میں اقبال عشق ہی عشق ہے۔ ذوق ہی ذوق ہے اس کا تفکر سراپا مشرقی ہے وہ مغرب کی ترقیوں کو دیکھتا ہے اور ایک ہی مصرعہ میں ختم کر دیتا ہے ۔

عقل تابال کشود است گرفتار تر است

وہ عشق کی قوت کو محسوس کرتا ہے اور ایک ہی مصرعہ میں فیصلہ کر دیتا ہے ۔

عشق از عقل فسوں پیشہ جگر دار تر است

علوم و سائنس کی تمام ترقی اس کے خیال میں ایک مشت خاک ہے جو پسر مریم کی آنکھ میں جھونکی گئی۔ شاعر کی نظر میں مغربی تمدن کا سرمایہ کس قدر حقیر ہے۔

جلوہ او بے کلیم وشعلہ او بے خلیل

وہ ہر جلوہ میں ایک کلیم ڈھونڈتا ہے اور ہر شعلہ میں ایک خلیل مانگتا ہے۔ کہاں تک شاعر کا یہ مذہب عشق، تہذیب وتمدن و سائنس علوم کے اٹھتے ہوئے طوفان کا حریف ہو سکے گا۔ یہ بحث ایک اور فرصت چاہتی ہے۔ اس وقت تو صرف شاعر کی نظر اس کا حوصلہ اور اس کا بیان زیر بحث ہے۔ وہ اسلام اور مشرقیت کا ترجمان بن کر مدعی بن کر دنیا کے سامنے آتا ہے۔ اس کے ادعا کو

دیکھیے اور اس کے ترجمہ کو دیکھیے وہ مغرب کی عقل سے آزاد ہو کر مشرق کے عشق میں مبتلا ہے۔ اس کو مبتلا رہنے دیجئے اور اس کے سمندر کی اٹھتی ہوئی لہروں کی موسیقی سے لطف اندوز ہو جیے، جہاں تک کہ آپ سے ہو سکے۔ ان چٹانوں سے قطع نظر کیجئے جن سے یہ لہریں ٹکرا رہی ہیں۔ عشق تنقید وتبصرہ سے بے پرواہے، عاشق اپنے کیف تمام سے ہمیشہ عاجز اور مجبور ہے۔

چہ کنم چہ چارہ گیرم کہ ز خویش علم ودانش
نہ دمیدہ ہیچ خارے کہ بدل نشانم اورا

☆☆

قدمے خرد فروزے کہ فرنگ داد مارا
ہمہ آفتاب لیکن اثر سحر نہ دارد

شاعر اس منزل میں ہے جہاں آفتاب کتنا ہی چمکے۔ وہ اثر سحر مانگتا ہے۔ انقلاب مانگتا ہے عقل کا انکار نہیں سننا چاہتا اور عشق کا اقرار چاہتا ہے۔ اقبال کا یہ وجدان اسی کے قلم سے کس بیتابی اور درد کے ساتھ بیان کرتا ہے۔

اے مسلمانان فغاں از فتنۂ ہائے علم وفن
اہرمن اندر جہاں ارزاں دیزداں دیر باب

انقلاب

انقلاب۔ اے انقلاب

گوئٹے کا فاوسٹ کچھ اسی رنگ میں عاجز آ کر چلاتا تھا۔

لعنت ہو ان بلند خیالات پر
جن سے ہمارا ذہن اپنے آپ کو دھوکہ دیتا ہے
لعنت ہو، مظاہر کی نظر بندی پر
جو ہمارے حواس پر قبضہ کر لیتی ہے
لعنت ہو شہرت اور بقائے دوام کے فریب پر
جو ہمیں خواب میں خوشامد کی لوری دیتے ہیں

لعنت ہو، مال و حشم پر
اقبال کی شاعری کا ملخص بھی کچھ ایسا ہی ہے
لعنت ہو، عقل فسوں پیشہ پر!
لعنت ہو، نیرنگ فرنگ پر
لعنت، ہو فتنہ ہائے علم و فن پر
لعنت ہو، کتاب خرد پر اور حکیمانِ فرنگ پر
لعنت ہو وطنیت پر
لعنت ہو، دانش مغربیان پر و فسلفہ مشرقیان پر
رحمت ہو، اس ادارہ ملت پر جو تیرہ سو برس پہلے عرب کے امی نے قائم کیا تھا۔
رحمت ہو، اس ادارہ پر اور جو کچھ اس کے اندر ہے اس پر

رموز بیخودی اسرار خودی، طلوع اسلام شمع و شاعر بانگ درا، پیام مشرق، زبور عجم، جاوید نامہ، ان سینکڑوں صفحات میں وہی ایک اہرمن، ہے اور وہی ایک یزدان، ہے جو ہزاروں ناموں سے لاکھوں اشاروں سے استعاروں سے، تلمیحات سے بار بار، بار بار بیان کیا گیا ہے، وہ ایک ہی حدیث عشق ہے کہ کہنے والا کہے جاتا ہے، کہے جاتا ہے، لیکن یہ سوال کہ اقبال کے ''دریائے بیتابی کی یہ موج خون، دانش مغربیاں، کی چٹانوں سے ٹکرا ٹکرا تھک جائے گی یا پھر ایک دن یہ سمندر ان چٹانوں کو پیس ڈالے گا۔ یہ سوال ایسا ہے کہ شاید اس کے حریف یہ اوراق نہیں ہو سکتے۔ شاعر بہر حال، اپنا کام کر رہا ہے اور پیغمبری کر رہا ہے اور پیغمبروں کی طرح پیشن گوئی کرتا ہے کہ اے ''دیار مغرب کے رہنے والو'

تمہاری تہذیب اپنے خنجر سے آپ ہی خودکشی کرے گی۔

جو دیکھ سکتے ہوں وہ دیکھیں جو سمجھ سکتے ہوں وہ سمجھیں۔ شاعر کو اس سے بحث نہیں کہ تم کیا سمجھے اور کیا نہ سمجھے۔ وہ تو اپنے میخانہ میں کسی خم کے سہارے بیٹھا اپنی فطرت حساس کے نقوش بے محابا دنیا کے سامنے پھینک رہا ہے

پیر مغاں فرنگ کی مے کا نشاط ہے اثر
اس میں وہ کیف غم نہیں مجھ کو تو خانہ ساز دے

وہ اس کیف غم اور اس خانہ ساز کی گہرائیوں میں محو ہو جاتا ہے۔ گم ہو جاتا ہے۔

خودی کے فلسفہ سے وطنیت، اور عقل و علم کی تمام سحر کاریوں کو ٹھکراتا ہوا شاعر اپنے مذہب کا بنیادی پیام دنیا کو پہنچا دیتا ہے۔ اس کے مذہب کا یہ رکن ''امید'' کا ایک جلوۂ مستحکم اور خوف اور مایوسی کا انکار قطعی ہے۔

☆☆

مرگ راساں ز قطع آرزو است زندگانی محکم از لا تقنطو است
نا امید از آرزوئے پیہم است نا امیدی زندگانی راسم است

☆☆

زندگی ما یاس خواب آور بود
ایں دلیل سستی عنصر بود

☆☆

اے کہ درزندانِ غم باشی اسیر
از نبی تعلیم لا تحزن بگیر

☆☆

گر خدا واری زغم آزاد شو
از خیال بیش وکم آزاد شو

اقبال کی نظر میں مسلم کے لئے بیم وخوف شرک قطعی ہے۔ وہ ایمان کی نفی ہے۔ زندگی میں موت کی ظلمت ہے، بیداری میں غفلت کا پیام ہے۔ بیم وخوف کا دروازہ بند کر کے شاعر ضمیر مسلم میں ''چراغ آرزو'' روشن کرنا چاہتا ہے۔

ضمیر لالہ میں روشن چراغ آرزو کردے
چمن کے ذرہ ذرہ کو شہید جستجو کردے

یہی شاعر کا پیام ہے جو آج بیس برس سے ایک چراغ آرزو، ظلمت خانۂ حیات میں روشن کے ہوئے ہے۔ ہر دفعہ نئے لباس میں شاعر کی روح اپنا پیام لے کر آتی ہے۔ ہر دفعہ نئے

لفافہ میں وہی ایک خط زندگی یہ پیغامبر لاتا ہے ہر دفعہ نئے رنگ میں نئی آواز سے نئے منتر سے وہ سوتوں کو جگانا چاہتا ہے کبھی کہتا ہے۔

اسرار ازل جوی برخود نظرے واکن
یکتائی وبسیاری پنہانی وپیدائی
برخیز ! کہ فرور دیں ، افروخت چراغ گل
برخیز دو مے بنشیں بالالۂ صحرائی

کبھی کہتا ہے

☆☆

بیا کہ نازہ نوامی تراو وازگ ساز مئے کہ شیشہ گداذ بہ ساغر اندازیم
مغان ودیر مغاں رانظارہ تازہ دہم بنائے میکدہ ہائے کہن بر انداز یم
زر ہزناں چمن انتقام لالہ کشیم بہ بزم غنچہ وگل طرح دیگر اندازیم

☆☆

بطوف شمع چو پروانہ زیستن تاکے
نہ خویش ایں ہمہ بیگانہ زیستن تا کے ؟

سفر کرتا۔ آوازیں لگاتا چلا جارہا ہے۔ مغرب کی وادیوں میں مشرق کے صحراؤں میں، یورپ کی آبادیوں میں ایشیا کے ویرانوں میں کہتا چلا جارہا ہے جو کچھ اس کو کہنا ہے لیکن اقبال ہر حال میں اور ہر منزل پر وہی تیرہ سو برس پہلے کا حدی خوان، شتر بان اور عرب بدوی ہے۔ وہ اپنے اونٹ کی نکیل ہاتھ میں لے کر مغرب اور مشرق کے آسمانون کے نیچے سر بلند گذرنا چاہتا ہے اور اپنی ملت کو بھی ساتھ لے جانا چاہتا ہے۔

مغرب ز تو بیگانہ مشرق ہمہ افسانہ
وقت است کہ در عالم نقش دگر انگیزی
آں کس کہ بہ سردار و سودائے جہانگیری
تکسین جنونش کن بانشتر چنگیزی

☆☆

ریگ عراق منتظر گشت حجاز تشنہ کام
خون حسین تازہ دہ کوفۂ وشام خویش را

☆☆

درون لالہ گذر چوں صبا تواند کرو — بہ یک نفس گرۂ غنچہ وتوانی کرو
حیات چیست جہاں را اسیر جاں کردن — تو خود اسیر جہانی کجا توانی کرو
مقدر است کہ مسجود مہرومہ باشی — مگر ہنوز نہ دانی چہا توانی کرو
اگر زمیکدۂ من پیالۂ گیری — دمشت خاک جہانے بپا توانی کرو

☆☆

مانند صبا خیز وزیدن دگر آموز — دامان گل ولالہ کشیدن دگرآموز
اندرولک غنچہ خریدن دگر آموز — ایں کوہ گراں است بکا ہے نفروشند
تخت جم ودارا سرار ہے نہ فروشند — باخون دل خویش خریدن دگر آموز
نالیدی وتقیدر ہماں است کہ بوداست — آن حلقۂ زنجیر ہماں است کہ بود است
نومید مشو ناکہ کشیدن دگر آموز

☆

حنا بند عروس لالہ ہے خون جگر تیرا
تری نسبت ابراہیمی ہے معمار جہاں تو ہے
تری فطرت میں ہے ممکنات زندگی کی
جہاں کے جو ہر مضمر کا گویا امتحاں تو ہے

☆☆

تو راز کن فکاں ہے اپنی آنکھوں پر عیاں ہوجا — خودی کا رازداں ہوجا خدا کا ترجماں ہوجا
نہیں ہے وابستہ زیر گردوں کمال شان سکندری سے — تمام ساماں ہے تیرے سینہ میں تو بھی آئینہ سا ہوجا
غرض ہے پیکار زندگی سے کمال پائی ہلال تیرا — جہاں کا فرض قدیم ہے تو از مثال نماز ہوجا
مصاف زندگی میں سیرت فولاد پیدا کر — شبستان محبت میں حریر وپرنیاں ہوجا

گذر جائیں گے سیل تند رو کوہ و بیاباں میں　　گلستاں راہ میں آئے تو جوئے نغمہ خواں ہو جا

یہ خاموشی کہاں تک لذت فریاد پیدا کر
زمیں پر تو ہو اور تیری صدا ہو آسمانوں میں

بلاشبہ اقبال کی لذت فریاد سے کہا جا سکتا ہے کہ

زمیں پر تو ہے اور تیری صدا ہے آسمانوں میں

لیکن اگر تمدن حاضرہ کے موجودہ دور ابتلاء میں جب ایک لعنت وجود انسانی پر مسلط ہے شاعر کی صدا نہ سنی گئی ہو تب بھی تم یہ تو نہیں کہہ سکتے کہ شاعر نے اپنا فرض انجام نہیں دیا۔ آج سے کچھ کم بیس برس پہلے اس نے ہندی مسلم کی نئی نسل کو جو پیام دیا تھا وہی آج تک اس کے ساز کے ہر تار سے ادا ہو رہا ہے۔

☆☆

اوروں کا ہے پیام اور میرا پیام اور ہے　　عشق کے درد مند کا طرزِ کلام او رہے
آتی ہے کوہ سے صدا راز حیات ہے سکوں　　کہتا ہے مورِ ناتواں لطف خرام اور ہے
موت ہے عیش جاوداں ذوق طلب اگر نہ ہو　　گردش آدمی ہے اور گردش جام اور ہے
شمع سحر یہ کہہ گئی سوز ہے زندگی کا ساز　　غمکدۂ نمود میں شرط دوام اور ہے

☆☆

نہیں ہے وابستہ زیر گردوں کمال شان سکندری سے
تمام ساماں ہے تیرے سینہ میں تو بھی آئینہ ساز ہو جا
غرض ہے پیکار زندگی سے کمال پائے ہلال تیرا
جہاں کا فرض قدیم ہے تو اذا مثال نماز ہو جا

☆☆

اٹھ کہ ظلمت ہوئی پیدا افق خاور پر
بزم میں شعلہ نوائی سے اجالا کر دیں
اہل محفل کو دکھا دیں اثر صیقل عشق

سنگ امروز کو آئینہ فردا کردیں

☆☆

تمنا آبرو کی ہو اگر گلزار ہستی میں — تو کانٹوں میں الجھ کر زندگی کرنے کی خو کر لے
نہیں یہ شان خودداری چمن سے توڑ کر تجھ کو — کوئی دستار میں رکھ لے کوئی زیب گلو کر لے
اگر منظور ہو تجھ کو فزاں نا آشنا رہنا — جہانِ رنگ و بو سے پہلے قطع آرزو کر لے

☆☆

طرب آشنائے خروش ہو تو نوائے محرم گوش ہو
وہ سرود کیا کہ چھپا ہوا ہو سکوت پردہ ساز میں
تو بچا بچا کے نہ رکھ اسے تیرا آئینہ ہے وہ آئینہ
کہ شکستہ ہو تو عزیز تر ہے نگاہ آئینہ ساز میں

شاعر اپنی زندگی کے آئینہ میں قوموں کی زندگی کو دیکھتا ہے۔ وہ مٹھی بھر مٹی اٹھاتا ہے اور ہر کنی میں ایک پارہ الماس ڈھونڈتا ہے وہی جو اس کے جسد خاکی میں ہے ہر مشت خاک میں ایک چنگاری۔ ایک انگارا تلاش کرتا ہے۔ وہی جس نے اس کے وجود معنوی میں حرارت زندگی قائم رکھی ہے۔ اس کے سوا وہ کچھ دیکھتا ہی نہیں۔ کچھ جانتا ہی نہیں۔ آہستہ کہتا ہے پھر لوگ سنتے نہیں تو چیخ اٹھتا ہے۔

تری خاک میں ہے اگر شرر تو خیال فقر و غنا نہ کر
کہ جہان میں نان شعیر پر ہے مدار قوت حیدری

☆☆

ہو صداقت کے لئے جس دل میں مرنے کی تڑپ — پہلے اپنے پیکر خاکی میں جاں پیدا کرے
پھونک ڈالے یہ زمین و آسمان مستعار — اور خاکستر سے آپ اپنا جہاں پیدا کرے
زندگی کی قوت پنہاں کو کردے آشکار — تا یہ چنگاری فروغ جاوداں پیدا کرے

☆☆

نفس گرم کی تاثیر ہے اعجاز حیات

تیرے سینہ میں اگر ہے تو مسیحائی کر
کب تلک طور پر درویزہ گری مثل کلیم
اپنی ہستی سے عیاں شعلۂ سینائی کر

☆☆

اے ہماز یمن دامت ارجمند
آشیانے ساز برکوہ بلند

☆☆

تاشوی درخورد پیکار حیات
جسم وجانت سوز واز نار حیات

☆☆

توشمشیری زکام خود بروں آ
بروں آ از نیام خود بروں آ

☆☆☆

نقاب از ممکنات خویش برگیر مہ وخورشید وانجم رابہ برگیر
وگر نہ آتش از تہذیب نوگیر بروں خود بیفروز اندرون میر

کتنے مایوس کو وہ راستے بتاتا ہے۔ کتنے گم کردہ راہ مسافروں کو وہ منزل کا پتہ دیتا ہے جو عالم خاکی میں مقید ہیں انہیں فضائے بسیط میں پروں کو پھیلانے کا نکتہ سمجھاتا ہے خود آگے بڑھتا جاتا ہے اور پیچھے آنے والوں کو بلاتا جاتا ہے

بگزر سراب وبہ پہنائے ہوا ساز ایں نکتہ نہ بیند مگر آں دیدہ کہ بینا است
گماں مبر کہ بہ پایاں رسید کار مغاں ہزار بادہ ناخوردہ درگ تاک است
چمن خوش است ولیکن چوغنچہ نتواں زیست قبائے زندگیش از دم صبا چاک است
بخود خزیدہ ومحکم کوہساران زی چوخس نرمی کہ ہوا تیز ومشعلہ بیباک است

☆☆☆

پاز خلوت کدۂ غنچہ بروں زن چوشمیم بانسیم سحر آمیز وزیدن آموز

اگرت خارگل تازہ رسے ساختہ اند　　پاس ناموس چمن دار وخلیدن آموز
باغباں گرز خیابان تو برکند ترا　　صفت سرود گرہارہ دمیدن آموز
تاکجا درتہ بال دگراں می باشی　　در ہوائے چمن آزارہ پریدن آموز

اپنی ملت کے ہر فرد اور ہر طبقہ کے لئے شاعر ایک دستور العمل اور ایک نصب العین پیش کرتا ہے۔ یہ نہیں کہ اس کی بلند آہنگی، عوام وخواص کی کمزوریوں اور مشکلات کو نظر انداز کر دیتی ہو کتنا ہی کمزور اور بے عمل کوئی فرد ہو شاعر نے اس کی اہلیت کے اندازہ سے اس کے لئے ایک راہ عمل تجویز کر دی ہے۔ خلوت کدہ غنچۂ کے آسودہ مکیں نسیم سحر کے جھونکوں کے ساتھ اپنی خلوت سے نکل چلیں۔ اگر وہ باد تند وگرم سے گھبراتے ہیں۔ جو کمزور انسان شبنم کی افتادگی اپنی فطرت میں رکھتے ہوں وہ کم از کم داغ دل لالہ سے اپنا واسطہ قائم رکھیں اگر کانٹوں سے گھبراتے ہیں جو کوئی باغ کے پھولوں میں کانٹے سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا، وہ کچھ خلش ہی پیدا کرنا سیکھ لے

جو غیروں کے دامن کے سایہ میں پرورش پا کر بے عمل ہو گئے ہیں وہ اپنے بازوؤں کی طاقت سے اڑنا سیکھ لیں مگر دو اسب کے لئے وہی ہے، پیام سب کے لئے یکساں ہے البتہ بہ اندازۂ اہلیت

بہ ہر مرض کہ بہ نالہ کسے شراب دہند

وزن کم وبیش ہے نسخہ وہی ہے جس کو ہزار طرح سے، ہزار عنوانوں کے تحت میں اقبال نے بیان کیا ہے۔

زقید وصید ن ہنگاں حکایتے آور
مگو کہ زورق ماروشناس دریانیست
شریک حلقہ رندان بادہ پیاباد
حذر نہ بیعت پیرے کہ مرد غوغانیست

علاج بتاتا ہے ہمتیں بڑھاتا ہے اس طرح کہ گویا بس نہیں چلتا کہ سننے والے کو اپنے ساتھ لے کر ہوا میں بلند ہو جائیں۔ اس کو اپنے علاج پر اتنا وثوق ہے کہ دین اور دنیا کی تمام نعمتوں کو ہر راہ رو کے سامنے رکھ دیتا ہے۔

بانشہ درویشی در ساز ودمادم زن
چوں پختہ شوی خود ابر سلطنت جم زن

چو خورشید پیدا نگاہ ہے می تواں کردن　　ہمیں خاک سیہ را جلوہ گاہے می تواں کردن

نگاہ خویش راز نوک سوزن تیز تر گرداں　　چو جوہر دردل آئینہ را ہے می تواں کردن
تو درزیر درختاں ہمچو طفلاں آشیاں بینی　　بہ پرواز آ کہ صید مہر و ماہے می تواں کردن
غلام ہمت بیدار آں سوارانم
ستارہ بہ سنان سفتہ در گرہ بستند

جہد بقا کے میدان میں شاعر اپنی قوم میں ایسے افراد مانگتا ہے جو مہر و ماہ کو شکار کرلیں۔ اور آسمان کے ستاروں کو نیزے کی نوک پر اٹھالائیں۔ اقبال زمین کی طرف دیکھتا ہی نہیں۔ اس کی نظر ہمہ وقت آسمان پر ہے گویا آسمان ہی اس کی زمین ہے وہ اپنی تمام سینہ کاویوں اور تراوشوں کو پہلو میں لے کر آنکھیں بند کرلیتا ہے اور اپنا وہی ایک خواب دیکھے جاتا ہے جو اس کو لاکھوں بیداریوں سے زیادہ عزیز ہے اس خواب میں بھی اس کا راگ وہی ایک راگ ہے

مژدہ اے پیمانہ برادر خمستان حجاز بعد مدت کے ترے رندوں کو پھر آیا ہے ہوش
پھر یہ غوغا ہے کہ لاساقی شراب خانہ ساز
دل کے ہنگامے مئے مغرب نے کرڈالے خموش
نغمہ پیرا ہو کہ یہ ہنگام خاموشی نہیں
ہے سحر کا آسماں خورشید سے مینا بدوش

اسی کیف بیخودی میں وہ بربط عالم کو اٹھالیتا ہے۔ اور اپنی زندگی کا ایک شاہکار شمع و شاعر کے نام سے دنیا کے سامنے پھینک دیتا ہے۔ پڑھ لے جس کو پڑھنا ہو۔ سمجھ لے جو سمجھ سکتا ہو

آسماں ہوگا سحر کے نور سے آئینہ پوش　　اور ظلمت رات کی سیماب پا ہوجائے گی
اس قدر ہوگی ترنم آفریں باد بہار　　نکہت خوابیدہ غنچہ کی نوا ہوجائے گی
آملیں گے سینہ چاکان چمن سے سینہ چاک　　یعنی گل کی ہم نفس باد صبا ہوجائے گی
شبنم افشانی مری پیدا کرے گی سوز و ساز　　اس چمن کی ہر کلی درد آشنا ہوجائے گی
دیکھ لوگے سطوت رفتار دریا کا مآل　　موج مضطر ہی اسے زنجیر پا ہوجائے گی
نالہ صیاد سے ہوں گے نواسا ماں طیور　　خون گلچیں سے کلی رنگین قبا ہوجائے گی
آنکھ جو کچھ دیکھتی ہے لب پہ آسکتا نہیں
محو حیرت ہوں کہ دنیا کیا سے کیا ہوجائے گی

☆☆☆

اقبال اکیڈیمی کا خبرنامہ

(اجتماعات)

''بیا بہ مجلس اقبال و یک دو ساغر کش''

توسیعی تقریر بعنوان ''شخصیت کی تعمیر فکر اقبال کی روشنی میں''

مقرر: ڈاکٹر ظفر محمود (آئی۔اے۔ایس) صدر اقبال اکیڈیمی دہلی

صدارت: ڈاکٹر محمد ضیاء الدین احمد شکیب

بتاریخ 4/مارچ 2012 بروز یکشنبہ بمقام اردو ہال حمایت نگر، حیدرآباد۔

علامہ اقبال کے پیام کو عام کرنے کی ضرورت

خصوصی نشست سے ڈاکٹر ظفر محمود کا خطاب

اقبال اکیڈیمی حیدرآباد کے زیر اہتمام ایک خصوصی نشست منعقد ہوئی جس کی صدارت ڈاکٹر محمد ضیاء الدین شکیب نے کی۔ جلسہ کی ابتدا جناب محمد ضیاء الدین نیر کارگذار صدر اقبال اکیڈیمی کی قرأت کلام پاک سے ہوئی۔ جناب سید امتیاز الدین معتمد اقبال اکیڈیمی نے کلام اقبال پیش کیا۔ جناب غلام یزدانی صدر محافل اقبال شناسی نے ڈاکٹر ظفر محمود (آئی اے ایس) کا تعارف کروایا۔ جناب یزدانی نے جناب ظفر محمود کی قابل ستائش خدمات کا تذکرہ کیا۔ سچر کمیٹی کی سفارشات اور ان کی عمل آوری کے سلسلہ میں ظفر محمود کی مساعی جمیلہ کا انہوں نے خاص طور پر ذکر کیا۔ سینٹ معاذ اسکول کی ہونہار طالبات نے اقبال کی مشہور نظم ''لب پہ آتی ہے دعا بن کے تمنا میری'' نہایت دلکش انداز میں پیش کیا۔ کنوینر اجلاس ضیاء الدین نیر نے بتایا کہ اقبال اکیڈیمی کلام و پیام اقبال کو نئی نسل میں عام کرنے کے لئے کوشاں ہے۔ ڈاکٹر ظفر محمود نے ''پیام اقبال کی روشنی میں شخصیت کی تعمیر'' کے زیر عنوان خطاب کیا۔ جناب ظفر محمود نے کہا کہ اقبال کو محض ایک شاعر سمجھنا اقبال کو ایک لحاظ سے نبی آخر الزماں کے پیغام کو عام کرنے والا انسان قرار دیا۔ انہوں نے سورہ شمس کی آیات کا حوالہ دیا جس میں ارشاد باری ہے کہ اللہ نے انسان کو روح کی پاکیزگی

صلاحیت دی ہے۔اقبال کا کہنا ہے کہ جو شخص اپنی روح کو جسم سے بلند تر کر لے وہ کامیاب ہے ۔ظفر محمود نے اپنی حق گوئی کا ذکر کیا کہ کس طرح نائب صدر جمہوریہ کے سامنے وقف کے مسائل کے تعلق سے بات رکھی اور کامیاب رہے۔ جناب ظفر محمود نے اقبال کے کئی اشعار سنائے اور ان کے عملی پہلوؤں پر روشنی ڈالی۔انہوں نے سامعین سے کہا کہ ہم قرآن کی آیات پر غور کریں تو ہماری صحیح رہنمائی ہوسکتی ہے،ہم صرف تلاوت کرتے ہیں غور نہیں کرتے،تو سدھریں گے کیس؟ صحیح خدمت وہی لوگ کر سکتے ہیں جو اپنے ذاتی مفاد کو بالائے طاق رکھیں ۔مسلمانوں کا تناسب سرکاری ملازمتوں میں نہایت کم ہے ۔ کیوں کہ مسلمان مسابقتی امتحان میں نہیں بیٹھتے۔ زکوٰۃ فاؤنڈیشن کی کوششوں سے تھوڑی بہت تبدیلی ہورہی ہے لیکن توجہ کی شدید ضرورت ہے۔اقبال کے پیام کو بھی عام کرنے کی شدید ضرورت ہے۔ڈاکٹر ضیاء الدین شکیب نے اپنی صدارتی تقریر میں کہا کہ اجلاس کی خصوصیت یہ رہی کہ نوجوان تعداد میں زیادہ شریک رہے۔انہوں نے کہا کہ فاضل مقرر نے مختلف آیات قرآنی اور اقبال کے کلام سے عملی مثالیں پیش کی ہیں۔ہمیں اپنے سے زیادہ دوسروں کے لئے سوچنا چاہیے۔نوجوانوں کو اپنی چھپی ہوئی صلاحیتیں بروئے کار لانے کی ضرورت ہے۔اقبال کے کلام پر اور زیادہ کام کرنے کی ضرورت ہے۔اقبال کو ہندوستان کا قومی شاعر تسلیم کیا جانا چاہیے۔اقبال کی شاندار یادگار قائم کی جانی چاہیے۔

جشن داغ دہلوی

زیر اہتمام اقبال اکیڈیمی حیدرآباد

جشن داغ دہلوی بتاریخ ۱۷ مارچ ۲۰۱۲ء بروز ہفتہ بمقام سالار جنگ میوزیم حیدرآباد

زیر صدارت: ڈاکٹر محمد ضیاء الدین احمد شکیب

مہمان خصوصی: پروفیسر محمد میاں وائس چانسلر مولانا آزاد یونیورسٹی

اظہار خیال: محمد ضیاء الدین نیر، محترمہ لکشمی دیوی راج، سید امتیاز الدین، مسٹر شیام گوپال سنچیر، فاطمہ بیگم پروین۔

ہفتہ 17/مارچ ساڑھے چھ بجے سالار جنگ ہال میں جشن داغ کا انعقاد عمل میں آیا۔

اس جشن کے ادبی اجلاس کی صدارت ڈاکٹر محمد ضیاء الدین احمد شکیب نے کی۔ پروفیسر محمد میاں وائس چانسلر مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی نے بہ حیثیت مہمان خصوصی، ممتاز سماجی کارکن محترمہ لکشمی دیوی راج اور مسٹر شام گوپال سنیچر (نواسہ مہاراجہ کشن پرشاد) نے بہ حیثیت مہمانان اعزازی شرکت کی۔ جناب ضیاء الدین نیر کارگذار صدر اقبال اکیڈیمی نے اپنے خطبۂ استقبالیہ میں کہا کہ اردو کے ہر بہی خواہ کا فرض ہے کہ وہ محسنین اردو کی خدمات کا اعتراف کر کے نہ صرف اپنی سعادت مندی کا اظہار کرے بلکہ اپنے علم ذوق وادب میں بھی اضافہ کرے۔ اقبال اکیڈیمی ایک معروضی فورم ہے۔ اس کی یہ کوشش ہے کہ نئی نسل کو اقبال سے آگاہ کیا جائے اور ایسے افراد تیار ہوں جو دور حاضر کے تقاضوں کے چوکھٹے میں اقبال کو سمجھ سکیں اور اس کی دانش نورانی کے امین بن سکیں۔ جناب سید امتیاز الدین معتمد اقبال اکیڈیمی نے داغ کی شاعری کا ایک مختصر جائزہ لیتے ہوئے اس عظیم شاعر کو زبردست خراج پیش کیا۔ انہوں نے کہا کہ حیدرآباد شروع ہی سے علم کا گہوارہ رہا ہے۔ سلاطین آصفیہ کی قدردانی کے باعث اہل علم دور دور سے یہاں آئے اور یہیں کے ہو کے رہے۔ داغ انہیں میں سے ایک تھے داغ کی شاعری انسانی جذبات کی ترجمانی ہے۔ اگر داغ کو اردو کا سب سے بڑا حسن پرست شاعر کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ ان کی جمالیاتی حس لڑکپن سے جوانی تک اور جوانی سے بڑھاپے تک بہ دستور قائم رہی یہی وجہ ہے کہ ان کی شاعری بھی اول تا آخر جوان اور تروتازہ دکھائی دیتی ہے۔ داغ کی سب سے بڑی خوبی ان کی زبان ہے۔ لمبی لمبی فارسی تراکیب اور مشکل الفاظ سے انہوں نے اپنے کلام کو بوجھل نہیں ہونے دیا۔ ان کی دھلی ہوئی بے مثل زبان اور منفرد طرز بیان نے ان کو جہان استاد بنا دیا۔ زبان کی شیرینی سے متاثر ہو کر اقبال نے بھی ان کی شاگردی اختیار کی۔ جناب امتیاز الدین نے داغ کے کئی خوبصورت اشعار سنائے جن سے اہل محفل بہت محظوظ ہوئے۔ فاضل مقرر نے اپنی تقریر میں مثنوی فریاد داغ اور شہر آشوب کے کچھ حصے سنائے۔ ابتداء میں امتیاز صاحب نے اقبال کی نظم داغ کے چند اشعار ترنم سے پیش کئے۔

پروفیسر فاطمہ بیگم پروین نے داغ کی ولادت، تعلیم وتربیت اور ابتدائی زندگی کے بارے میں تفصیلی روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ نظام دکن محبوب علی پاشاہ نے اپنے استاد کی جیسی قدر

ومنزلت کی اس کی مثال شاید ہی کہیں ملے۔ایک ہزار روپے ماہانہ وہ بھی اس وقت جب کہ لوگوں کی گذر بسر تین روپیہ ماہانہ میں ہو جاتی تھی جس کا داغ نے خود اعتراف کیا ہے۔

کی میری قدر مثل شاہ دکن
کسی نواب نے نہ راجہ نے

☆

آرزو ہی رہی صبح وطن کی مجھ کو
شام غربت ہے عجب وقت سہانا تیرا

حیدرآباد اور حیدرآبادیوں کی محبت اور اس مٹی کے جادو نے داغ کو تاابد اس کا حصہ بنا دیا۔

پروفیسر محمد میاں چانسلر مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی نے بہ حیثیت مہمان خصوصی کہا داغ اردو کے عظیم المرتبت شاعر تھے۔اگر چہ میں اردو ادب کا طالب علم نہیں رہا۔پھر بھی بچپن سے داغ کا کلام پڑھتا اور سنتا آیا ہوں۔انہوں نے داغ کے چند منتخب اشعار کے حوالے سے بتایا کہ داغ عشق ومحبت، زندہ دلی اور حرکت وعمل کے شاعر تھے اور ان کی شاعری سے اردو کو بہت ترقی ملی۔پروفیسر محمد میاں نے جشن داغ منانے پر اقبال اکیڈیمی کو مبارکباد دیتے ہوئے اس بات کی یقین دہانی کی کہ آئندہ جب کبھی اقبال اکیڈیمی حیدرآباد اس قسم کا پروگرام بنائے گی اس میں مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی کا پورا تعاون حاصل رہے گا۔

محترمہ لکشمی دیوی راج نے داغ کے مزاج کی تزئین نو اور جشن داغ منائے جانے پر اپنی مسرت کا اظہار کرتے ہوئے تجویز پیش کی درگاہِ یوسفین کے سامنے کی سڑک کا نام داغ روڈ رکھا جائے۔

مسٹر شیام گوپال مہاراجہ سنیچر کشن پرشاد کے نواسہ اور مسٹر احمد الدین مہاراجہ کشن پرشاد کے پوتے دونوں حضرات کو گل دستے پیش کئے گئے ان دونوں حضرات نے اس اعزاز پر اقبال اکیڈیمی کا شکریہ ادا کیا۔

ڈاکٹر محمد ضیاء الدین احمد شکیب نے صدارتی کلمات میں داغ کی شاعری پر جناب سید

امتیاز الدین اور داغ کی زندگی پر پروفیسر فاطمہ بیگم پروین کے خطاب کو سراہتے ہوئے داغ کو زبردست خراج عقیدت پیش کیا۔ ڈاکٹر شکیب نے کہا اردو برصغیر کی ایک بڑی زبان ہے اور برصغیر ہندو پاک کے ہر علاقے کی زبان کے ساتھ سمجھوتا کرتے ہوئے اردو نے نشونما پائی ہے۔ اور اس کی پچاس سے زیادہ علاقائی شکلیں بن گئی ہیں۔ جن کی مثال ڈاکٹر شکیب نے اپنی تقریر میں دی۔ انہوں نے کہا کہ اتنی زیادہ علاقائی شکلوں کے باوجود کل ہند سطح پر معیاری اردو کی اپنی شکل ہے اٹھارویں اور انیسویں صدی میں دہلی میں میر، سودا، غالب وذوق سے دبستان دہلی کی تکمیل ہوئی۔ اس طرح لکھنو میں میر وسودا اور انشاء اور مصحفی کے پہنچے کے بعد آتش وناسخ کے زمانے میں دبستان لکھنو کی تشکیل ہوئی۔ تاہم دبستان دہلی کو داغ نے مقام عروج پر پہنچایا جس طرح میر، انیس اور امیر مینائی نے دبستان لکھنو کو اپنے نقطۂ عروج پر پہنچایا۔ یہ حیدرآباد کی خوش قسمتی ہے کہ داغ اور امیر کے ساتھ دبستان لکھنو اور دہلی کے یہ دونوں عظیم نمائندے یہاں آگئے اور یہ دونوں مرکز دکن منتقل ہوگئے داغ اور میر اگر دکن نہ آتے تو حیدرآباد میں بھی قدیم دکنی ہی بولی جاتی۔ حیدرآباد میں استاد شمس الدین فیض نے دہلی اور لکھنو کے نئے محاوروں کا استعمال کیا جو ان کا ایک اہم کارنامہ ہے۔

ڈاکٹر شکیب نے بتایا کہ اگرچہ داغ کی شاعری رندانہ تھی لیکن ان کے یہاں زبان اور محاوروں کا حیرت ناک برتاؤ ہے۔ تدریسی نقطۂ نظر سے داغ کی شاعری نہایت اہم ہے۔ داغ کے معاصرین میں مولانا حالی نے شہیدان کربلا کی محبت میں عظیم الشان مرثیے لکھ کر اردو زبان کو آسمان تک پہنچادیا۔ ڈاکٹر شکیب نے جشن داغ منانے پر اقبال اکیڈیمی حیدرآباد کی زبردست ستائش کی۔ ساتھ ہی انہوں نے وائس چانسلر مولانا آزاد یونیورسٹی سے یہ خواہش ظاہر کی کہ وہ اردو زبان وادب کے کے تعلق سے ایک معیاری تحقیق رسالہ شائع کردیں۔

ادبی اجلاس کے اختتام پر موسیقی کا پروگرام شروع ہوا جس میں گلوکار صابر حبیب اور گلوکارہ پوروا گرو نے اپنی مسحور کن آواز میں داغ کا کلام ساز پر پیش کیا۔ اس جلسے میں نئے اور پرانے شہر کے باذوق سامعین کے علاوہ شہر کی کئی ممتاز شخصیتوں نے شرکت کی۔

تقریب رسم اجراء: ہند میں ترکوں کے عظیم کارنامے، مصنف

محمد عبدالقیوم سابق نائب ناظم محکمہ آثار قدیمہ

زیر اہتمام: اسلامک ہیریٹیج فاؤنڈیشن،

زیر صدارت: ڈاکٹر محمد ضیاء الدین شکیب۔ بتاریخ ۱۸۔ ڈسمبر ۲۰۱۱ء، بمقام گلشن خلیل

ڈاکٹر صادق نقوی نے مہمان خصوصی کی حیثیت سے شرکت کی۔ جناب سجاد شاہد، جناب محمد ضیاء الدین نیر، ڈاکٹر سید داؤد اشرف نے اظہار خیال کیا۔ جناب سید امتیاز الدین نے کلام اقبال سنایا اور ڈاکٹر آمنہ تحسین نے نظامت کے فرائض انجام دیئے۔

☆☆☆

یہ ہندی، وہ خراسانی، یہ افغانی، وہ تورانی
تو اے شرمندۂ ساحل چھل کر بیکراں ہوجا
مصاف زندگی میں سیرت فولاد پیدا کر
شبستانِ محبت میں حریر و پرنیاں ہوجا
ہو حلقہ یاراں تو بریشم کی طرح نرم
رزمِ حق و باطل ہو تو فولاد ہے مومن

the Asrar and the Rumuz to reach the Javed Namah, the other runs on to the Zabur-e-Ajam. The Javed Namah deals with problems of powers, of leadership, probing society and civilization and the human personality. The Zabur, as Iqbal himself has said, is poetry to be read in solitude - Agar ho zauq to khilvat mein parh Zabur-e-Ajam. The javed Namah leans towards reason, the Zabur towards intuition. In my opinion the two stream merge in the best poems sand ghazals of the Bal-e-Jibril, producing some of the finest philosophical poetry found in the Indo-Persian literature. But that is another story the telling of which would need another session.

defiance of Iblis, the song of time and the dialogue between man and God. The tone and the language in the Payam are more assured than in the Bagn-e-Dara. In the section called the "Mai-e-Baqi". Hafiz seems to come alive with a twentieth century consciousness, and Iqbal in the phrasing of the great Persian pleads for ecstasy infused with awareness.

I would like here to call the attention of Iqbal's reader to a particular point about his poetry before I wind up, a point which is often inadvertently missed or ignored, but which is of central importance for a full understanding of Iqbal's Opera Poetica. I refer to the peot's sense of isolation and loneliness which is co-ordinate with the loneliness of man as man "l'uomo che e solo con se" (man who is alone with himself). In the Bang-e-Dara there is a small poem on this theme entitled "Tanhai" (Loneliness)-Kis shai ki tujhe havas hai ai dil ("what is it you miss my heart"). In the Payam-e-Mashriq this feeling has acquired cosmic dimensions. In a poem, which has the same title as the one in the Bang-e-Dara, the protagonist, which is the poet himself, which is man in his cosmic status, sets out on a journey across oceans and mountains, and beyond the earth , to the moon asking them if they have any affinity with him. They all keep to themselves and say nothing. He finally reaches the presence of God to tell him that the universe has nothing in common with him - Jehan tehi ze dil o musht-e khak-e mun hama dil (The Universe lacks what I have, a heart) in reply he merly gets a knowing smile.

From the Bang-e-Dara and the payam-e-Mashriq two streams flow out. One passes (publication chronology over-looked) through

leads to gentleness and compassion .It is the coming together of power and compassion that iqbal saw in perfection in the person of the Prophet of Islam, a fusion which made the Prophet , as the Persian poet, Jami, put it, both "Shah-e-shahan" and "Shah-e-gadayan" ie. alike King of kings and King of the poor.

With the Khizr-e-Rah Iqbal's poetry reaches a take off point. His thought deepens and take over the direction of his poetry. Iqbal uses the myth of Khizr to probe the life of man on earth. Like, Tiresias in Eliot's "Waste Land", the deathless Khizr provides flashes of universal and prophetic insights into life and society. There is no room here for a detailed analysis of this poem, but it gives clear indications of the philosophic poet feeling his way forward with steady steps. Iqbal's crucial idea of life as a constant and progressive movement, his strong dislike of exploitation, imperialism and the capitalist order all receive their early definition in this poem.

If I had time and space I would sketch a detailed critical reading of the Payam as I have done to an extent, in the ease of the Bang-e-Dara, but in view of the limitations of a lecture I would content myself with a few general remarks. Of all Iqbal's works the Payam is closest to the Bang-e-Dara, thematically and stylistically. It is one of the finest of Iqbal's Persian works and at places touches pure poetry as no other work does. The landscape her is varied and rich, Nature, as poems like "Bu-e-gul", "Surood-e-Anjum", "Lalah", "Kirmak-e-Shabtab" and "shabnam" testify, is still a joy in itself, and the philosophic strain of some of the poem of the Bang-e-Dara gets more strongly defined, for example, in the "Lala-e-Tur", and in the poem about the fall of Adam and his arrival on earth, the mystic

there are poems in it in which the poet of the first part comes alive, e.g. in "Chand" and "Shaer" (p.187 and p.235) and others in which the poet to come is beign born, e.g. the "Khizr-e-Rah" and the "Irteqa" (pp. 288,249). Before we take a look at the 'Khir-e-Rah', there is one more very significant poem of iqbal in this section which we should note, his poem on the death of his mother, one on the finest and one of the best constructed of his poems E.M. Forester once called Iqbal 'anti-humanitarian'. In a letter (quoted in Dr. Rafiq Zakaria's foreword to Mr. Khushwant singh's English version of the "Shikvah" and the "Javab") he once wrote "Humanitarian has two senses : (i) development of human powers and (ii) compassion ad responsibility felt by the strong for the weak's failures. Iqbal (as far as I can gather from Vahid's book and it is almost my only authority) was humanitarian in sense (i) but not in sense (ii)". Forester's only source of knowing Iqbal, according to his own assertion is Mr. S.A. Vahid's book on the poet. This would obviously mean that Mr. Vahid's presentation is inadequate. I have already referred to Iqbal's gentleness and his closeness to the child. Let me now refer to his poem on the death of his mother (see Bang-e-Dara p. 255).

Any one who reads the poem and its moving lines will have little doubt about Iqbal's humanitarian quality. What Forster is looking for is compassion. The equivalent of compassion in Urdu-Persian tradition is dard, a term which is even deeper and more comprehensive that compassion. And if iqbal is not a poet of dard, he is not a poet at all. For lack of it paradise itself is a dead world to him. Forster naturally could have no notion as to how Iqbal's power

Bang-e-Dara which should not be skipped. These are poems in which Iqbal speaks of his love in the romantic sense, the love for a woman (ishq-e-majazi). To modern taste these poems might appear too mild, but there are glimpses in them of a passion sophisticated by a deep culture and good manners. Only a lover could write lines like those in the poem entitled "Visal" (Union) where the poet speaks of how it is the imprisonment of love that has liberated him (pp. 126,27).

These poems are particularly educative for those readers of iqbal who never allow him to get off a pedestal if not the pulpit. Further the love song in Iqbal's later poetry is going to change so much in tone and tenor that it is time we paused here and relished it.

When we move on to the third and last section of the Bang-e-Dara which opens with the "Balad-e-Islamyah" and reaches a climax in the "Shikvas, we find ourselves in a changed ambience. The change is not really sudden, we had indications of it in earlier poems like "Bilal", Abdul Qader Ke Nam" and "Saqliyah" but it certainly seems quite pronounced. If we read, for example, the poem on "The Poet and the Candle" - the candle has appeared thrice earlier in the first section - we can sense the difference. Iqbal's rhetoric is at its most powerful in those poems in this section which made him famous throughout Muslim India. Poetically the third section has appeared to me as a kind of hyphen between Iqbal's early romantic poetry and his later philosophical verse. It is in this section that historic time assumes such importance for iqbal. Great as the "Shikvah" is. I tend to regard it as a pause in Iqbal's onward journey. But the third part of the Bang-e-Dara is not all of a piece,

between the two emerges which consists in the awareness of the 'burning' which is peculiar to the man (pp.32,33).7

Iqbal does not rue this human sensibility, the capacity to suffer and have awareness of one's suffering; he does not cry out in despair " adieu, adieu" when the moment of communion with nature is past and the consciousness of the self returns. On the contrary he regards this consciousness as a seminal, germinal force, seen at its best in man but operative even in the inanimate world, giving every object its special identity (p.33).8

In poems like "Himala", "Abr-e-Kohsar", Ek Arzoo" etc Iqbal is an entrance spectator. Nature unveils its beauties before his fascinated eye, and, as he watches, he is not troubled by any intrusive thoughts. But unlike Wordsworth, who seems to be an active influence at this time, he does not move towards pantheism. Nature can unlock sources of wonder any joy in man, it can stimulate his questioning soul but it does not admit of apotheosis for him. Revelation, which is the highest event for man, comes though other sources, in the "Aftab-e-subh" addressing the sun- and let us remember that as an image and symbol the sun continues to shine in Iqbal's poetry to the end iqbal writes that while the sun open out the world to the eye it needs a different vision for the inner ye to open (p.37)

Iqbal finds the beauty of natural objects fascinating but static, and contrasts it with the restless, dynamic sensibility of man . As an example one can refer to lines 1,3,9,10 and 11 in the "Gul-e-Rangin" (pp.6,8).

There is a small group of minor poems in the second part of the

wonder has surfaced, mixed with a carefree response to beauty, e.g. in the "Gul-e-Rangin" where he address the rose to say that he watches it with the bulbul's (lover's) eye, unconcerned with intrusive philosophic considerations (Bang-e-Dara. p.6)

Kam mujh ko deeda-e-hikmat ke uljheron se kya
Deeda-e-bulbul se main karta hun nazzara tera.

Those poems in the first section of the Bang-e-Dara call for particular attention where a tension develops between a sense of wonder and a persistent questioning of the mind, eg. In the "Moth and the candle" (p.27): why does the moth love the candle so much? Does it find solace in burning itself to death?

Does it find eternal life in the candle's flame? In another poem, "Khuftagan-e-Khak se Istefsar" he wants to know from the dead if man is a victim of restless questioning in the other world too (p. 26):

Van bhi insan hai qateel-e zauq-e istefham kya.

Even while fascinated, the poet's eye is searching for a secret at the core of things, what in Urdu-Persian literary tradition has been termed raz-e-daroon-e khana. In several poems of the Bang-e-Dara, as in English Romantic poetry, man develops a close relationship with Nature, and yet there is something in man that keeps him apart, the aching heart in his breast is what nature lacks (p.77) :

Dard jis pehlu mein utthta hai who pehlu aur hai.

And this separateness is not, as in Keats's "Nightingale", the result of a waking up to reality but an awareness of an evolutionary difference. In the poem on the candle (Shama) the poet and the candle have the same identity --- I too burn and suffer like you (i.e. the candle) - but as the poem proceeds the significant difference

feeling. Because of this perhaps when I find people using titles like Allama Iqbal, or Shair-eMashriq or Tarjuman-e-Haqeeqat for the poet, the child in me protests and cannot understand why such heavy phrases are beign used for a man who had written "The Plaint of a Bird", and "The Glow-worm", and "A Child's Prayer". This, with your leave, is a bit of autobiography but what I am trying to drive at is the fact that, among other things. Iqbal is a friend of the child, that he is gentle in the sense in which poets like Wordsworth and Blake were gentle. His poems for children apart, there are several pieces in which he has caught the endearments of childhood and the tremors of child's heart. I would like here to refer to the following poems: "The Lamp and the Child" (Bachcha aur Shama) , pp. 94, 95, verses 1,9,11: "The Infant" (Tifl-e-Shirkhwar) p.60, vv 1,2 "Childhood" (Ahd-e-Tifli),p.8 vv. 1,3,4,53 In these verses Iqbal speaks with deep tenderness about the child's absorption in watching a candle flame, in watching the moon pacing through tattered clouds, the wrapt childish interest in the fictitious stories about the moon, even in the clanging of the door chain meant to divert his/her attention. There is a remarkable freshness in the poems of the first part of the Bang-e-Dara. The diction is an advance on Hali-outside the Musaddas- and Mohammad Hussain Azad, the two major writers who gave a new tone to Urdu poetry. Iqbal's mind is still free form the serious preoccupations of his later period. With an unburdened eye the poet views the beauty that manifests itself in Nature and its varied forms. "Himala", "Gul-e-Rangin", "Abr-e-Kohsar","Shama", "Aftab", "Tifl-e-Shirkhawar", "Jugnu" are poems in which a lively sense of

Iqbal's admirers, has been largely partial or heavily weighted in favour of a premise. Rarely do we come across a reader or a critic who allows Iqbal's poetry to sink in his mind and then grow and expand in those various directions that sometimes appear contradictory to minds unfamiliar with the characteristic way wardness of a truly poetic sensibility. The point to note is the poetry of Iqbal is not a static structure but a moving spiral, the journeying of a soul across nature and the human landscape. If the journey envisages an ultimate goal it does not follow that the mind of the poet has always been in a state of having arrived. In accompanying the poet on this journey lies the real adventure of reading him, the joy of experiencing a pilgrimage in which, as Iqbal has himself put it in a different context, it is the moving on that exhilarates (Masti-e-makhiram-e ma).

The starting point for this journey I consider be the Bang-Dara (1924). This book was published long after the Asrar (1915) and the Rumuz (1918) and even after the payame-Mashriq (1923), but most of its poems belongs to a much earlier period.The poems of its first two sections, for example were written between 1900 and 1908. Anyone who has read the Bang-e-Dara in early days or heard its poems in childhood is never likely to agree with that picture of the poet in which he is represented as an austere thinker concerned with deeply philosophic ideas , or a writer with a flair for sermonizing, or as some people still think, a mere orthodox Muslim preaching his creed to the world. For my part, I had the luck to listen to some of Iqbal's early poems, when a small child, from my mother who read them out in her soft and musical voice with great

expereicne as the core of the approach that I suggest, because that experience is more reliable than any other and it alone can give some touch of authenticity to what I am going to say.

Let me imagine, then, a reader of Iqbal who is roughly equipped like me, may be little more o ra little less. It is an Indian reader with a fair knowledge of Urdu and its literature, a fairish knowledge of English, some acquaintance with Persian language and literature, and an awareness of the history of the Indian sub-continent and of the highlights of Islamic history. To such a reader who has not had the time to think of any particular approach to Iqbal's poetry , I wish to address a few suggestions.

Iqbal's poetry can be viewed within several orbits, within the orbit of the Islamic faith of Indo -Islamic thought, of the Indian political struggle of pre-independence days, of stylistics of the Indian Renaissance which began with Ram Mohan Roy, of the Islamic Renaissance which bean with Jamaluddin Afghani, of the Urdu and Persian literary development in India, of the that Islamic thought and culture of which the boundaries extend from Hijaz and Egypt to Iran, Afghanistan and India and which embrace such men as Ibn-al-Arabi, Imam Al Ghazali, Imam Ibn-e-Taimya, Shah Waliullah,Al Jeelani, Jamaluddin Afghani, Jalaluddin Rumi, Khwaja Hafiz, Mirza Bedil, Mirza Ghalib and Iqbal himself. From one orbit to another the movement and curve of Iqbal's poetry would vary. But we are not concerned with a channelized study of Iqbal,we are concerned with that aesthetic and cognitive verbal complex *per se* which we call Kalam-e-Iqbal, with the object of acquiring some kind of ordered and balanced response to the complex. This response, even on the part of

to me in fact", he states, " that these concept, these generalisations had their origin in my sensibility". (pp. 19,20) This would imply that as a reader he was applying his own sensibility to the work of the poets whom he studied.

Let us say that when we read a poet we try subconsciously to fuse subjective elements with objectivism we have learnt from empirical science, our knowledge of human history, of other arts, other languages, linguistics, semantics, philosophy , the opinions or views of other people and of established scholars.

This preamble is meant to indicate the complexity of the experience which the reading of a poet , specially as complex poet, is. When suggesting an approach to the reading of a poet, by which I mean roughly a reading scheme , the question that has to be dealt with before proceeding further is what kind of reader is presently envisaged. Basically this reader is myself. I am concerned initially at least, and vitally, with my own experience of iqbal's poetry, and let me state right at the start that it has been an experience that spans my entire life. Over this long period contact with Iqbal's poetry has never been constant, nor has the approach to it been scholarly or, most of the time, even critical. It has been the approach of an average man of culture with some knowledge of history, some acquaintance with a few languages and with poetry written in them, a rough awareness of trends in the modern world, and a sensibility for poetry somewhat refined and catholicized over the years. However, I have no wish to make this lecture a piece of autobiography, in such a context can only be of marginal interest, if not exasperating to the well informed reader. I wish only to use my

out according to principles other than those of basic communication. : George Steiner here is concerned with :interactions between semantic units".

This attitude with its emphasis on *explication de text* has served a useful purpose in as much as it has brought greater precision to criticism and to the reading of poetry, but it cannot explain or even appreciate fully a creative act, nor can it totally analyse a reader's response to a work of art. When men and women read (or recite aloud to themselves) lines of a poem, it is not merely their linguistic and semantic consciousness which is at work, much besides is involved, for example, their sense of time and space, their awareness of the contemporary world and of past history, their consciousness of the moment in which the reading is taking place, their entire background, their entire life *vis a vis* the world that the poet confronts them with. I therefore like to maintain that a fair amount of subjectivity is implied in all reading and understanding of poetry , in fact even in all scholarly or philosophical criticism T.S. Eliot, for example, in his convocation lecture at the University of Leeds, 1961, published under the title "To Criticise the Critic", admits that concepts like the dissociation of sensibility and objective correlative' ("Hamlet and his Problems"), concepts which apparently seemed the result of an objective study were caused by his "reaction against the poetry... of the nineteenth and early twentieth centuries" coupled with his "passion for the poetry.... of the late sixteenth and early seventeenth centuries" and his "bias towards the more mature plays of Shakespeare". He calls these phrases "conceptual symbols for emotional preferences". "It seems

Professor Syed Sirajuddin

AN APPROACH TO THE READING OF IQBAL'S POETRY

There exists a delicate, tenuous relationship between reader and poet. In one sense all criticism outside Ph.D. theses is an exploration of this relationship. Whatever might be said in favour of objectivity what is involved in all reading is the interaction of two minds, one in a communicative or at least exteriorising mood and the other in a receptive or apprehensive mood. Criticism at one stage was eager to discover the intention of the writer, to find out what he really meant. For this it would have recourse to the personality and life of the writer. But it was later found that this could be a frustrating quest. Apart from the fact that it is so difficult t analyse motives and moods, there is the further difficulty of the medium of expression. If nothing else language itself which is supposed to hold a mirror to intention stand out as a barrier, as modern linguistics and semantics have shown and as the poet Ghalib put it: "when all veils are torn off there remains the obstacle of the seeing eye".

With the development of linguistics the idea has grown of reading literature as a verbal structure "Every work of literature". Says a recent critic, ".....is a specialized language - act (what the latest school of criticism in France calls *ecriture*)."

"Certain lexical an syntactical material", he continues, " is filled

IQBAL REVIEW

April 2012

English Section

Vol : 22 Issue : 1
April 2012

ISBN:81-86370-51-X

(JOURNAL OF THE IQBAL ACADEMY HYDERABAD)
April 2012

"IQBAL REVIEW"

IQBAL ACADEMY
Gulshan-e-Khaleel, Masab Tank, Hyderabad - 28, A.P. INDIA.